عورت معمارِ انسانیت

فہرست

فطرت کا نظام

فطرت کے نظام سے انحراف کا نام ناکامی ہے اور فطرت کے نظام سے مطابقت کا نام کامیابی۔ یہ زندگی کی تعمیر کا بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کو سمجھے بغیر موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔

انسان کو یہ جاننا چاہیے کہ جس دنیا میں وہ رہ رہا ہے اس کو بنانے والا وہ خود نہیں ہے۔ دنیا کو خدا نے اپنے نقشہ کے مطابق بنایا ہے۔ انسان کو ہر حال میں اس نقشہ سے مطابقت کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ خود اپنے نقشہ کے مطابق رہنا چاہے تو اس کو ایک اور دنیا کی تخلیق کرنی پڑے گی۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں اس کے لیے دوسرا کوئی انتخاب سرے سے ممکن ہی نہیں۔

قوامیت کا اصول

دنیا کو بنانے والے نے اس کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں چیزوں کو متحد اور منظّم انداز میں چلانے کے لیے ان کا ایک مرکز (nucleus) ہوتا ہے۔ یہی مرکز اس کے مختلف اجزاء کو جوڑ کر رکھنے کا ذریعہ ہوتا ہے:

(nucleus) the central part of something around which other parts are collected or situated.

مادہ کا ابتدائی یونٹ ایٹم ہے۔ ایٹم کے اندر منفی اور مثبت برقی ذرّات ہوتے ہیں۔ ان متحرک ذرّات کو باہم جوڑنے کا کام ایک نیوکلیس کرتا ہے جو ایٹم کے بیچ میں موجود ہوتا ہے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ شمسی نظام (solar system) کا ہے۔ اس خلائی مجموعہ میں بہت سے سیارے (planets) اور سیارچے (asteroids) ہیں۔ ان تمام اجزاء کو جوڑنے والا سورج ہے۔ سورج اس مجموعہ کے درمیان ہے جس کے گرد تمام سیارے اور سیارچے مسلسل گھوم رہے ہیں۔

یہی نظام کائنات کی تمام چیزوں میں قائم ہے۔ مثال کے طور پر شہد کی مکھیوں کو لیجئے جو پورے

معنوں میں ایک زندہ سماج کا نمونہ ہیں۔ یہ مجموعہ رات دن متحرک رہتا ہے۔ اس مجموعہ کو باضابطہ انداز میں متحرک رکھنے کا ذریعہ چھتہ کے اندر کی وہ بڑی مکھی ہوتی ہے جس کو رانی (queen) کہا جاتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کے درمیان اگر ان کی کوئین موجود نہ ہو تو ان کا پورا نظام بکھر جائے گا۔

فطرت کا یہی قانون انسانی زندگی کے لیے بھی مطلوب ہے۔ اس قانون کا تعلق مرد اور مرد کے درمیانی معاملات سے بھی ہے اور عورت اور مرد کے درمیانی معاملات سے بھی۔ قرآن جو خالق فطرت کی کتاب ہے، اس میں ارشاد ہوا ہے:

> کیا یہ لوگ تمہارے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ان کے رزق کو تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تا کہ تمہارا بعض تمہارے بعض کو خدمت گار بنائے۔ (الزخرف ۳۲)

اسی اصول تنظیم پر انسانی زندگی کا پورا نظام چل رہا ہے۔ چنانچہ مزدوروں کے اوپر ایک سپروائزر ہوتا ہے، کمپنی میں ایک ڈائرکٹر ہوتا ہے، میٹنگ میں ایک چیرمین ہوتا ہے، آفس میں ایک باس (boss) ہوتا ہے، حکومت میں ایک صدر یا وزیر اعظم ہوتا ہے، وغیرہ۔ اسی اصول پر زندگی کے تمام اجتماعی معاملات چلتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو زندگی میں انارکی (anarchy) پیدا ہو جائے اور کوئی معاملہ درست طور پر نہ چل سکے۔

خدا کے قانون کے مطابق، عورت اور مرد یا بالفاظ دیگر خاندانی زندگی کا ڈھانچہ تنظیم کے اسی اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **الرجال قوامون علی النساء** (النساء ۳۴) یعنی مرد عورتوں کے اوپر قوّام ہیں۔

قوّام کے معنٰی عربی زبان میں نگراں اور منتظم کے ہیں۔ ''مرد قوام ہیں'' کا مطلب یہ نہیں کہ مرد افضل ہے اور اس کے مقابلہ میں عورت غیر افضل۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خاندانی معاملات کے انتظام یا بندوبست کے لیے خالق نے یہ فطری اصول مقرر کیا ہے کہ گھر کے داخلی مجموعہ میں مرد منتظم کی ذمہ داری کو سنبھالے تا کہ خاندان کا نظام اسی طرح درست طور پر چل سکے جس طرح

بقیہ کائنات کا نظام اسی اصول تنظیم کو اختیار کر کے درست طور پر چل رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں آزادئ نسواں (women's lib) کے علمبرداروں نے صنفی برابری (gender equality) کا اصول بنایا۔ یہ اصول سراسر غیر فطری تھا۔ چنانچہ اس اصول کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ جدید سماج میں خاندانی نظام انارکی کا شکار ہو گیا۔

کسی آفس میں اگر اسی طرح مساواتِ کارکن (workers equality) یا کسی حکومت میں اسی طرح مساواتِ وزراء (ministers equality) کا طریقہ رائج کیا جائے تو پورا آفس انارکی کا شکار ہو جائے گا اور حکومت کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فکری اور عملی تضاد کی بات ہے کہ دنیا کے تمام دوسرے شعبوں کے نظام کو تو قوامیت کے اصول پر چلایا جائے اور گھر کے داخلی نظام کو غیر قوامیت کے اصول پر۔ یہ تضاد یقینی طور پر غیر فطری ہے، اس لیے وہ قابل عمل بھی نہیں۔

مرد کو عورت کے اوپر قوام بنانا اسی طرح ایک عملی بندوبست کی بات ہے جس طرح آفس میں کارکنوں کے اوپر ایک ہیڈ (head) مقرر کیا جاتا ہے اور حکومت میں وزیروں کے اوپر ایک وزیر اعظم بنایا جاتا ہے۔ قوام کا لفظ صرف عملی بندوبست کو بتاتا ہے نہ کہ اخلاقی معنوں میں فضیلت یا امتیاز کو۔ قوام کے اصول کو ہمیں ایک عملی ضرورت کے طور پر لینا ہے۔ اور جہاں تک رتبہ اور درجہ کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دونوں یکساں طور پر برابر کے عزت اور احترام کے مستحق ہیں۔

تقسیم کار کا اصول

اسی طرح قرآن کے مطابق، خاندانی تنظیم کا ایک اصول یہ ہے کہ عورت بنیادی طور پر گھر کے داخلی نظام کو سنبھالے اور مرد بنیادی طور پر معاش کی فراہمی کا ذمہ دار ہو۔ یہ بات قرآن میں اس طرح بتائی گئی ہے: **الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم (النساء ۳۴)** یعنی مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کیے۔

اس آیت میں فضیلت کا لفظ امتیاز کے معنٰی میں نہیں ہے بلکہ وہ مزید استعداد (additional quality) کے معنٰی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تخلیقی نقشہ کے مطابق مرد کو جسمانی اعتبار سے زیادہ مضبوط(strong) بنایا گیا ہے۔ وہ سختیوں کو سہنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ مرد کے اندر یہ اضافی صلاحیت اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ وہ معاشی جدوجہد کی مشکلات کو برداشت کرے۔ وہ سرد و گرم حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے لیے اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے رزق حاصل کرے۔

تخلیقی نقشہ کے مطابق، عورت کا کام بنیادی طور پر گھر کے داخلی نظام کو سنبھالنا ہے، اسے اگلی نسل کے افراد کو تیار کرنا ہے۔ اس بنا پر عورت کے اندر اس خاص پہلو سے کچھ اضافی خصوصیت (additional quality) رکھی گئی ہے۔ مثلاً نرمی اور انفعالیت وغیرہ۔ اگر عورت اور مرد دونوں اس تخلیقی راز کو سمجھیں اور دونوں اپنے اپنے دائرہ میں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کریں تو گھر کے اندر کا نظام اور گھر کے باہر کا نظام دونوں یکساں طور پر کامیابی کے ساتھ چلے گا۔ اور اگر اس تخلیقی نقشہ کی رعایت نہ کی جائے تو خاندانی زندگی کے معاملات درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔

موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مساوات کے غیر فطری نظریہ کے تحت یہ ہوا کہ عورت اور مرد دونوں باہر کے کام کو سنبھالنے کے لیے دوڑ پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہر کی دنیا میں مصنوعی طور پر بے روزگاری(unemployment) کا مسئلہ پیدا ہوا۔ مردوں کے لیے روزگار کے مواقع پوری طرح موجود تھے۔ مگر جب عورتیں بھی اپنے گھروں سے نکل کر روزگار کے مواقع میں حصہ دار بن گئیں تو یہ تناسب قدرتی طور پر ٹوٹ گیا اور وہ مسئلہ پیدا ہو گیا جس کو بے روزگاری کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ عورتیں اپنے گھروں سے باہر نکل آئیں۔ انھوں نے اپنی ان ذمہ داریوں کو چھوڑ دیا جو انہیں فطری نظام کے تحت اپنے گھروں کے اندر انجام دینا تھا۔

فطرت کے نظام کو توڑنے کا نتیجہ نہایت بری شکل میں نکلا۔ سماج کے اندر نئے نئے سنگین مسئلے پیدا ہو گئے۔ عورتوں کے باہر آنے سے کوئی نیا تعمیری کام نہ ہو سکا۔ کیوں کہ گھر سے باہر آ کر جو کام

انہوں نے سنبھالا اس کو کرنے کے لیے معقول تعداد میں لوگ موجود تھے مگر جہاں تک گھر کا تعلق ہے وہ صرف عورتوں کو کرنا تھا، اس لیے وہ اجڑ کر رہ گیا۔

موجودہ زمانہ میں انسانی سماج بے شمار مسائل سے دوچار ہے۔ یہ مسائل براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس تلخ حقیقت سے جڑے ہوئے ہیں کہ سماجی زندگی کے ایک شعبہ میں ضرورت سے زیادہ کام ہو رہا ہے اور سماجی زندگی کے دوسرے شعبہ میں سرے سے کام ہونا ہی بند ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس معاملہ میں از سر نو غور کیا جائے اور ری اسسمنٹ (reassessment) کے ذریعہ پھر سے سمجھا جائے کہ زندگی کی تشکیل کا صحیح فطری نظام کیا ہے۔

ذریعۂ سکون، نہ کہ ذریعۂ تفریح

خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، عورت کو مرد کے لیے سکون کا ذریعہ بنایا گیا ہے نہ کہ تفریح کا ذریعہ۔ یہ بات قرآن میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: **و من آیتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا و جعل بینکم مودۃ و رحمۃ ان فی ذٰلک لآیات لقوم یتفکرون** (الروم ۲۱) یعنی خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، عورت اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ زندگی میں مرد کے لیے سکون کا ذریعہ بنے۔ یہ پہلو دونوں ہی صنفوں کے لیے بے حد اہم ہے۔ اگر دونوں صنف کے لوگ اس پہلو کو سامنے رکھیں تو دونوں کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ زندگی کے مسائل سے معتدل طور پر نپٹ سکیں گے۔ وہ زندگی کے سفر کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔

مگر موجودہ زمانہ میں فطرت کے اس اصول کو بدل دیا گیا ہے۔ مردوں نے عورت کو اپنے لیے تفریح (entertainment) کا ذریعہ سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کا پورا نقشہ بگڑ کر رہ گیا۔ عورت کو فطری طور پر جہاں اپنا حصہ ادا کرنا تھا وہاں وہ اپنا حصہ ادا نہ کر سکی اور دوسری جگہ جہاں حصہ ادا کرنا تخلیقی

نقشہ میں شامل نہ تھا وہاں وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بنانے میں مصروف ہوگئی۔ یہ ایک غیر فطری صورت حال تھی۔ اس نے زندگی کے سارے معاملات کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کی عورت کی سب سے زیادہ توجہ اپنی فطری ذمہ داریوں کی ادائیگی پر نہیں ہے بلکہ اپنے جسم کی آرائش پر ہے۔ بیوٹیفیکیشن (beautification) نے جنون کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہ عورتیں اپنے اوقات کا بڑا حصہ غیر ضروری طور پر اپنے جسم کی مصنوعی تزیین میں صرف کرتی ہیں۔ اس شوق نے ان کو نیم برہنگی تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ وہ چیز ہے جس کو پورنا گرافی (pornography) کہا جاتا ہے۔ اس جنون نے جو مکروہ صورتیں اختیار کی ہیں ان میں سے ایک کاسمٹک سرجری (cosmetic surgery) ہے۔ یعنی سرجری کے ذریعہ اپنے چہرہ کو مصنوعی طور پر خوبصورت بنانا۔ خوبصورت بنانے کی یہ ٹیکنیک اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک مہنگی تدبیر ہے جس نے نئے نئے مسائل پیدا کر کے لاکھوں عورتوں کی زندگیوں کو غیر ضروری پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

عورت اور مرد اگر فطرت کے نقشہ کے مطابق، ایک دوسرے کو سکون کا ذریعہ سمجھیں تو ان کی زندگی جنت کی زندگی بن جائے لیکن تفریح کا ذریعہ سمجھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب عورت اور مرد دونوں بے سکونی کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے موجودہ زمانہ میں وہ عمومی برائی پیدا کی ہے جس کو ڈپریشن (depression) کہا جاتا ہے۔

فطرت سے انحراف انسان کے لیے ان مصیبتوں کا سبب بن گیا ہے۔ اب فطرت کی طرف واپسی انسان کو ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ موجودہ بحران سے نکلنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔

زوجین کا اصول

اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو جوڑے (pairs) کی صورت میں بنایا ہے۔ یعنی ہر چیز کا ایک بالمقابل جوڑا۔ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے فطری منشاء کی تکمیل کرتی ہے۔ اس اصول کو قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

و من کل شئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے تا کہ تم دھیان کرو) الذاریات ۴۹۔

دنیا کی تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی شکل میں پیدا کی گئی ہیں — مادہ میں مثبت اور منفی ذرّے، نباتات میں نَر اور مادہ، حیوانات میں مذکر اور مؤنث، انسان میں عورت اور مرد۔ زوجین کا یہی اصول پوری کائنات میں ہے اور یہی اصول انسانوں کے اندر بھی عورت اور مرد کی صورت میں قائم کیا گیا ہے۔

زوجین کے اس فطری اصول کا یہ نتیجہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے سے مل کر اپنا وہ فریضہ ادا کرتے ہیں جو فطرت کے نظام کے تحت ان سے مطلوب ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے تکملہ (complement) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مِل کر مکمل وجود بنتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل وجود بن جاتے ہیں۔

جدید تہذیب نے عورت اور مرد کے درمیان صنفی مساوات (gender equality) کا تصور پیش کیا ہے۔ یعنی عورت اور مرد دونوں بالکل یکساں طور پر ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ جو عورت ہے وہی مرد ہے، اور جو مرد ہے وہی عورت ہے۔ دونوں کے درمیان صنفی اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فرق موجود نہیں۔ یہ صنفی مساوات بظاہر ایک خوبصورت تصور معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ واضح طور پر فطرت کے نقشہ کے خلاف ہے۔ اور جو چیز فطرت کے نقشہ کے خلاف ہو وہ سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔

جیسا کہ اوپر کے قرآنی حوالہ سے معلوم ہوتا ہے، خالق نے اس دنیا کی ہر چیز کو جوڑے

جوڑے (pairs) کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ جوڑوں کی یہ تقسیم دونوں کے درمیان مساواتی تقسیم کو نہیں بتاتی بلکہ یہ تکمیلی تقسیم کو بتاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ عورت اور مرد کا باہمی معاملہ صنفی برابری (gender equality) کا نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح طور پر یہ معاملہ صنفی تکملہ (gender complementality) کا ہے۔یعنی عورت اور مرد دونوں ایک کامل وجود کا نصف ہیں۔ وہ ایک واحد انسانی شخصیت ہیں جس کا نصف حصہ عورت ہے اوراس کا بقیہ نصف حصہ مرد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے جوڑے کا معاملہ بھی وہی ہے جو دوسری چیزوں میں جوڑے کا ہے۔مثلاً ماڈی چیزوں کے ابتدائی یونٹ کو ایٹم کہا جاتا ہے۔ ہر ایٹم میں بیک وقت دو مختلف پارٹکل ہوتے ہیں، ایک منفی پارٹیکل(negative particle)اور دوسرا مثبت پارٹیکل (positive particle)۔یہ دونوں زوجین کی حیثیت سے ہر مادی چیز کا حصہ ہیں۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان دونوں اجزاء کے درمیان مذکورہ قسم کی مساویانہ برابری (equality) ہے۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ جو منفی پارٹیکل ہے وہی مثبت پارٹیکل بھی ہے۔اور جو مثبت پارٹیکل ہے وہی منفی پارٹیکل بھی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی کمی کی تکمیل کرتے ہیں، جو ایک میں نہیں ہے وہ دوسرے میں ہے، اور جو دوسرے میں نہیں ہے وہ پہلے میں ہے۔

یہی معاملہ عورت اور مرد کا بھی ہے۔عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے مساویانہ فریق کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے تکمیلی پارٹنر کی حیثیت رکھتے ہیں۔دونوں کو مل کر مشترک عمل کے ذریعہ اپنا فریضۂ حیات ادا کرنا ہے۔عورت کے بغیر مرد ادھورا ہے، اوراسی طرح مرد کے بغیر عورت ادھوری ہے۔

جدید تہذیب کے تصورِ مساوات کے مطابق، جو انسانی سماج بنایا جائے وہ یقیناً ایک مصنوعی سماج ہوگا۔ نظامِ فطرت سے عدمِ مطابقت (incompatibility) کی بنا پر وہ کبھی کامیاب انسانی سماج نہ بن سکے گا۔ چوں کہ فطرت کے نظام کو بدلنا ممکن نہیں ہے اس لیے اس معاملہ میں کوئی بھی

تدبیر فطرت سے انحراف کی غلطی کی تلافی نہیں بن سکتی۔

جیسا کہ معلوم ہے، پوری مادی دنیا منفی پارٹیکل اور مثبت پارٹیکل کے باہم ملنے سے بنی ہے۔ یہ اتحاد پوری مادی دنیا کو مکمل طور پر ہم آہنگ کیے ہوئے ہے۔ اگر ایسا ہو کہ یہ دونوں پارٹیکل اپنی خاصیت کے اعتبار سے یکساں ہوجائیں یعنی جو وصف (property) منفی پارٹیکل میں ہے عین وہی وصف مثبت پارٹیکل میں بھی ہوجائے۔ اور جو وصف مثبت پارٹیکل میں ہے وہی وصف منفی پارٹیکل میں بھی ہوجائے تو پوری مادی کائنات اچانک منتشر (disintegrate) ہوجائے گی۔

یہی معاملہ عورت اور مرد کا ہے۔ عورت اور مرد کا اجتماع اگر باہمی تکمیل کے نظریہ کے تحت ہو، جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے، تو انسانی سماج ایک متحد اور ہم آہنگ سماج بنے گا۔ وہ باہمی تضادات سے خالی ہوگا۔ اس کے برعکس اگر عورت اور مرد کا اجتماع، تہذیب جدید کے اصول کے مطابق، دونوں صنفوں کی یکساں برابری کے اُصول پر قائم کیا جائے تو پورا انسانی سماج انتشار کا شکار ہوجائے گا۔ سماج میں ہر طرف ٹوٹے ہوئے خاندان (broken homes) کا منظر دکھائی دینے لگے گا، جیسا کہ آج مغربی سماج میں دکھائی دیتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہاری جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم اُن سے سکون حاصل کرو۔ اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں (**ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیها و جعل بینکم مودة ورحمة ان فی ذٰلك لاٰیٰت لقوم یتفکرون**) الروم، ۲۱۔

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے ساتھ خدا کی یہ ایک خاص رحمت ہے کہ اُس نے اُس کے لیے اُسی کے جیسا ایک زوج (جوڑا) بنایا۔ مزید یہ کہ یہ جوڑا منفی ذرہ اور مثبت ذرہ کی طرح صرف ایک مادی جوڑا نہیں ہے۔ بلکہ انسان کے اندر اس جوڑے کے لیے مودت اور رحمت رکھ دی گئی ہے تا کہ وہ اُس سے سکون حاصل کرسکے۔

یہ بات مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے زوج ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے سکون اور محبت کا ذریعہ ہیں۔ موجودہ دنیا ہنگاموں سے بھری ہوئی دنیا ہے۔ یہاں ہر وقت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں عورت اور مرد دونوں کے لیے ایک ذریعۂ سکون درکار ہے۔ خالق کا یہ ایک حکیمانہ انتظام ہے کہ اُس نے عورت اور مرد دونوں کو ایک دوسرے کے لیے سرچشمۂ مودت بنا دیا۔ اس طرح دونوں کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ زندگی کی جدو جہد میں مشغول ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے سکون حاصل کرسکیں۔

زندگی کی جدوجہد ہر انسان کے لیے ایک شدید معرکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معرکہ کے دوران بار بار ایسا ہوتا ہے کہ انسان ذہنی دباؤ (stress) کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہر مرد اور ہر عورت کے لیے ایک ایسی مددگار چیز درکار ہے جو اُس کے لیے ڈی اسٹریسنگ (de-stressing) کا کام کرے۔ جو اُس کے ذہنی دباؤ کو رفع کر کے دوبارہ اُسے معتدل ذہنی حالت پر لے آئے۔ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے اسی ڈی اسٹریسنگ کا ذریعہ ہیں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے برابر طاقت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

زوجین کا رشتہ اگر صحیح طور پر قائم ہو اور دونوں ایک دوسرے کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھیں تو شادی شدہ زندگی اختیار کرنے کے بعد ہر گھر ایک ادارہ (institution) بن جائے۔ یہ ادارہ عورت اور مرد دونوں کے لیے ایک ایسا مرکز حیات ہوگا جو دونوں فریق کے لیے سب سے بڑی طاقت ہو۔ جو دونوں فریق کو اس قابل بنائے کہ وہ زندگی کے سفر میں کبھی اپنے کو تنہا نہ سمجھیں۔ وہ ناموافق حالات میں بھی زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھیں، یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔

قرآنی تصور کے مطابق، سماجی زندگی میں عورت اور مرد کے درمیان تقسیم کار کا اُصول رکھا گیا ہے۔ اس بنا پر دونوں صنفوں کا میدانِ کار (work place) بنیادی طور پر الگ الگ رہتا ہے۔ گویا کہ دونوں ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ الگ بھی ہیں اور اپنی مشترک کارکردگی کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے بھی ہیں۔

جدید تہذیبی تصور میں یہ نقشہ بالکل مختلف ہوجاتا ہے۔اس نقشہ میں تقسیمِ کار کے بجائے توحید کار کے اصول کو اختیار کیا جاتا ہے۔مغربی دنیا میں اگرچہ آج بھی عملاً زیادہ تر تقسیم کار کا اصول ہی رائج ہے۔مگر نظری اعتبار سے جو ہونا چاہئے وہ یہی ہے کہ دونوں صنفوں میں مکمل طور پر توحید کار کا اُصول اختیار کیا گیا ہو۔اگرچہ غیر فطری اصول ہونے کی بنا پر اس قسم کی مفروضہ توحید کار نہ تو ممکن ہے اور نہ بالفعل وہ کہیں پائی جاتی ہے۔

اسلام میں عورت اور مرد کے درمیان جس صنفی فرق کو تسلیم کیا گیا ہے وہ صرف عملی ضرورت کی بنا پر ہے۔اس کے علاوہ جہاں تک عزت اور حقوق کی بات ہے، دونوں صنفوں کے درمیان مکمل برابری ہے۔عزت اور احترام کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کسی بھی قسم کا فرق و امتیاز جائز نہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، دنیا کی ہر چیز میں زوجین (pair) کا اصول رکھا گیا ہے۔یہی اصول عورت اور مرد کی صورت میں انسان کے درمیان بھی موجود ہے۔تاہم زوجین کا یہ معاملہ دونوں صنفوں کے درمیان صرف فرق (difference) کو بتاتا ہے نہ کہ دونوں کے درمیان امتیاز (distinction) کو۔یہ فرق اس لیے ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے زندگی کے عمل کو بہتر طور پر انجام دیں۔تاہم یہ ایک عالمی اصول ہے کہ کوئی کلیہ استثناء سے خالی نہیں۔چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہر عموم میں ایک استثناء ہوتا ہے۔

Every rule has some exceptions.

یہ استثنائی اصول عورت اور مرد دونوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔بعض عورتیں آپ کو ایسی دکھائی دیں گی جو بظاہر عورت ہونے کے باوجود مردوں جیسی صلاحیت رکھتی ہیں۔اسی طرح بعض ایسے مرد آپ کو نظر آئیں گے جو بظاہر مرد ہوتے ہوئے عورت والی صفت کے حامل ہوں گے۔اس قسم کا استثناء مردوں میں بھی پایا جاتا ہے اور عورتوں میں بھی۔مگر اس استثناء کی بنیاد پر کوئی قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا۔یہ ایک تسلیم شدہ اصول ہے کہ قانون ہمیشہ عمومی صورت حال کو دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔استثنائی مثالیں عمومی قانون سازی کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

دنیا میں انسان کو سوچنے اور کرنے کی آزادی دی گئی ہے، اس لیے یہ پوری طرح انسان کے امکان میں ہے کہ وہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی صرف ذاتی عمل کی حد تک ہے۔ جہاں تک نتیجہ کا معاملہ ہے، اس معاملہ میں انسان کو کوئی آزادی نہیں۔ نتیجہ بہر حال وہی نکلے گا جو فطرت کے قانون کے مطابق نکلنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زوجین کے فطری اصول کو توڑنے کی آزادی بلاشبہہ ہر عورت اور مرد کو ہے۔ مگر نتیجہ وہی نکلے گا جو کہ نکلنا چاہیے، نہ کہ وہ جس کی بطور خود امید رکھی گئی ہو۔

عورت قرآن میں

قرآن میں انسان کی کامیابی کے لیے جو تعلیمات آئی ہیں وہ مرد اور عورت دونوں کے لیے ہیں۔ بظاہر اگرچہ ایسا ہے کہ بیشتر آیتیں مذکر کے صیغہ میں ہیں یعنی بظاہر اُن کا خطاب مرد سے ہے۔ مگر یہ ایک لفظی اسلوب کی بات ہے۔ ورنہ تغلیباً قرآن کی تمام تعلیمات دونوں ہی صنفوں سے اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے تعلق رکھتی ہیں۔ کوئی حکم بظاہر گرامر کے لحاظ سے مرد کو خطاب کرتا ہو تب بھی اپنے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے یہ مانا جائے گا کہ اُس کا خطاب مرد اور عورت دونوں سے ہے۔

مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، اس سے وہ نکلنے والا نہیں۔ اس طرح منکروں کی نظر میں اُن کے اعمال خوش نُما بنا دیئے گئے ہیں۔ (الأنعام ۱۲۳)۔

اس طرح کی بہت سی آیتیں قرآن میں ہیں جن میں قرآن کے مطلوب عقائد اور مطلوب اعمال کا ذکر ہے۔ ان آیتوں میں بظاہر مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی گرامر کے لحاظ سے اس کا خطاب بظاہر مردوں سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ تمام آیتیں عورتوں سے بھی اُسی طرح متعلق ہیں جس طرح وہ مردوں سے متعلق ہیں۔ تاہم زیر نظر باب میں منتخب طور پر صرف اُن قرآنی آیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مونث کے صیغہ میں آئی ہیں۔ جن میں گرامر کے اعتبار سے بھی خطاب براہ راست عورتوں سے ہے۔

قرآن میں بار بار عورت کا ذکر آیا ہے، کبھی ایک پہلو سے اور کبھی دوسرے پہلو سے۔ کبھی حیاتیاتی شخصیت کے اعتبار سے اور کبھی اجتماعی زندگی کے ایک رُکن کی حیثیت سے۔ قرآن کی ان آیتوں کو ترتیب وار لے کر یہاں درج کیا جاتا ہے۔ ان آیتوں کے مطالعہ سے عورت کے بارہ میں وہ

بنیادی تصویر واضح طور پر اور مستند طور پر سامنے آجاتی ہے جو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق عورت کی تصویر ہے۔

ا۔آدم اور حوا کی تخلیق

قرآن میں عورت کا پہلا ذکر آدم اور اُن کی بیوی حوّا کے حوالہ سے آیا ہے۔اس حصۂ قرآن کا ترجمہ یہ ہے:

> اور ہم نے (تخلیق کے بعد) کہا کہ اے آدم، تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ، جہاں سے چاہو۔اور اس درخت کے نزدیک مت جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔پھر شیطان نے اس درخت کے ذریعہ دونوں کو لغزش میں مبتلا کر دیا اور ان کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔اور ہم نے کہا، تم سب اُترو یہاں سے۔تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنا اور کام چلانا ہے ایک مدت تک۔پھر آدم نے سیکھ لیے اپنے رب سے چند بول تو اللہ اس پر متوجہ ہوا۔بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ہم نے کہا تم سب یہاں سے اُترو۔پھر جب آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ انکار کریں گے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلائیں گے تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (البقرہ ۳۵۔۳۹)

آدم اور حوّا کا یہ ذکر قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی آیا ہے۔مثلاً سورہ الاعراف رکوع ۲ میں۔قرآن کے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ابتداء میں آدم اور حوا کو جنت کے باشندہ کی حیثیت سے پیدا کیا اور دونوں کو جنت کے ماحول میں رہنے کی اجازت دے دی۔مگر عورت اور مرد دونوں اس کے اہل ثابت نہ ہو سکے کہ جنت اُنہیں پیدائشی حق (birth right) کے طور پر دے دی جائے۔اُنہوں نے جنت میں ممنوعہ درخت کا پھل کھا کر اپنے آپ کو اس عمومی استحقاق سے محروم کر لیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ عورت اور مرد کو جنت انتخابی بنیاد (selective basis)

پر دی جائے۔ چنانچہ دونوں کو جنت سے نکال کر موجودہ زمین پر آباد کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم دونوں زمین پر رہو اور اپنی نسل بڑھاؤ۔ تمہارے پاس بار بار خدا کی طرف سے پیغمبر آئیں گے جو تم کو بتائیں گے کہ خدا کے معیار کے مطابق، حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ جو لوگ خدائی معیار کے اس ٹسٹ پر پورے اتریں وہی دوبارہ ابدی جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ اور بقیہ مرد اور عورتوں کو نااہل قرار دے کر اُنہیں جنتی زندگی سے محروم کر دیا جائے گا۔

موجودہ زندگی میں ہر مرد اور عورت اسی خدائی ٹسٹ پر ہیں۔ یہ ٹسٹ نسل در نسل قیامت تک جاری رہے گا۔ اس کے بعد سارے انسان اپنے کارنامۂ حیات کے مطابق، دو گروہوں میں بانٹ دیے جائیں گے۔ کامیاب گروہ کو دوبارہ جنت میں ابدی داخلہ ملے گا اور ناکام گروہ کو جہنم کے کائناتی کوڑا خانہ میں ڈال دیا جائے گا۔

۲۔ نکاح کا انتخاب

عورت اور مرد کے درمیان نکاح کے ضمن میں جو تعلیمات قرآن میں آئی ہیں اُن میں سے ایک تعلیم یہ ہے:

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اور مومن کنیز بہتر ہے ایک مشرک عورت سے، اگر چہ وہ تم کو اچھی معلوم ہو۔ اور اپنی عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں، مومن غلام بہتر ہے ایک آزاد مشرک سے، اگر چہ وہ تم کو اچھا معلوم ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ وہ اپنے احکام لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔ (البقرہ ۲۲۱)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا رشتہ اسلام میں، عام تصور کے مطابق، کوئی تفریح نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذمہ داری ہے۔ ایک عورت اور ایک مرد نکاح کے رشتہ میں بَندھ کر یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے رفیق بن کر زندگی کی ذمہ داریوں کو نبھائیں گے۔ وہ انسانیت کے قافلہ کے صحت مند ممبر بنیں گے۔ نکاح کے اس مقصد کو سامنے رکھا جائے تو ظاہری خوش نمائی کی چیزیں

اضافی بن جاتی ہیں اور زیادہ اہمیت اس بات کی ہوجاتی ہے کہ عورت اور مرد کے اندر معنوی صفات زیادہ پائی جاتی ہوں۔

مزید یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ فطرت نے تقسیم میں یہ عمومی اصول رکھا ہے کہ جس مرد یا عورت کے اندر ظاہری خوش نمائی زیادہ پائی جائے اُس کے اندر معنوی خوبیاں کم ہوں۔ اسی طرح جس عورت یا مرد کو معنوی صفات زیادہ دی گئی ہوں اُن کو ظاہری خوش نُمائی میں کم حصہ ملا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقلمندی کا تقاضا ہے کہ وقتی قسم کی ظاہری خوش نمائی کو کم اہمیت دی جائے اور مستقل نوعیت کی معنوی صفات کو زیادہ قابلِ ترجیح سمجھا جائے۔

۳۔ طلاق کا شرعی طریقہ

اسلامی شریعت میں عورت اور مرد کے درمیان اصل مطلوب چیز نکاح ہے۔ طلاق کی حیثیت صرف ایک انتہائی استثنائی ضرورت کی ہے، نہ کہ عمومی حکم کی۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أبغض الحلال الی الله الطّلاق** (اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلال چیز طلاق ہے) **مشکوۃ المصابیح بحواله سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب الخلع و الطلاق** (رقم الحدیث ۳۲۸۰)

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو کہ وہ طلاق لے کر جُدا ہونا چاہیں تو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ فوری طور پر طلاق دے کر دونوں ایک دوسرے سے مستقل طور پر جدا ہوجائیں۔ بلکہ شریعت کے مطابق، اس کا ایک مقرر طریقہ (prescribed method) ہے۔ یہ طریقہ قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے:

طلاق دوبار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اُسلوبی کے ساتھ رخصت کردینا۔ (البقرہ ۲۲۹)

زوجین کے درمیان طلاق کا خیال عام طور پر غصہ کی حالت میں آتا ہے۔ شوہر کو عورت کی کسی بات پر ناراضگی ہوئی۔ پھر دونوں میں تکرار ہوئی جو شدید غصہ تک پہنچ گئی۔ اس طرح غصہ کی حالت میں

انتہائی اقدام کے طور پر شوہر کے منھ سے نکل جاتا ہے کہ میں نے تم کو طلاق دیا۔ مگر شریعت کے مطابق، طلاق کی تکمیل کے لیے تین بار طلاق ضروری ہے۔ اور یہ تین طلاق تین مہینہ میں الگ الگ دیا جانا چاہیے۔ یعنی دو مہینہ میں ایک ایک بار طلاق اور پھر تیسرے مہینہ میں یا تو فائنل طلاق یا رجوع۔ یہ طریقہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ غصہ ہمیشہ وقتی ہیجان کے تحت ہوتا ہے۔ اس لیے جب وقت گذرتا ہے تو غصہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ طلاق کا خیال بھی۔ گویا طلاق کے مذکورہ طریقہ کا مطلب طلاق پر روک قائم کرنا ہے، نہ کہ طلاق کو حتمی حیثیت دینا۔

کچھ مسلمان ایسا کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی مجلس میں اور ایک ہی بار تین طلاق دے دیتے ہیں۔ یہ بلا شبہہ شرعی قانون کا غلط استعمال (misuse) ہے۔ چنانچہ خلیفۂ ثانی عمر فاروق کے زمانہ میں جب کچھ لوگوں نے ایک مجلس میں تین طلاق دی تو حضرت عمر کے حکم سے اُن کی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے۔

۴۔ معاملہ کی کتابت اور گواہی

قرآن کے مطابق، جب دو آدمیوں کے درمیان کوئی لین دین کا معاملہ ہو تو اُس کو کاغذ پر تحریر کر لیا جائے اور اُس پر گواہی درج کر لی جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اے ایمان والو، جب تم کسی مقررہ مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اُس کو لکھ لیا کرو۔ اور اس کو لکھے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا اللہ نے اس کو سکھایا اسی طرح اس کو چاہیے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق آتا ہے۔ اور وہ ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس پر حق آتا ہے بے سمجھ ہو یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہیے کہ اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ کر لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ

انکار نہ کریں جب وہ بلائے جائیں۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اس کو لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کا طریقہ ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہہ میں نہ پڑو۔ لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں لین دین کیا کرتے ہو تو تم پر کوئی الزام نہیں کہ تم اس کو نہ لکھو۔ مگر جب تم سودا کرو تو گواہ بنالیا کرو۔ اور کسی لکھنے والے کو یا گواہ کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہارے لیے گناہ کی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (البقرہ، ۲۸۲)

مالی لین دین میں ہمیشہ دو فریق ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں باہمی اعتماد قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاملہ کو کاغذ پر لکھ لیا جائے۔ تاکہ ایک فریق اگر معاملہ کے بارہ میں ایسی بات کہے جس سے دوسرا فریق اتفاق نہ کرے تو کاغذی تحریر دونوں کے درمیان فیصلہ کی بنیاد بن سکے۔

ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی کا سبب یہ نہیں ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں کمتر حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دراصل ایک فطری ضرورت ہے جس کا اظہار خود قرآنی آیت میں اس طرح کیا گیا ہے کہ اگر دونوں میں سے کوئی ایک بات کو بھول جائے تو دوسری عورت اُس کو یاددلا دے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کو بعض پہلوؤں سے الگ الگ صلاحیتیں دی ہیں۔ کوئی صلاحیت جو ایک میں ہے وہ دوسرے میں نہیں۔ مثلاً مرد کے دماغ کی بناوٹ اور عورت کے دماغ کی بناوٹ میں فرق ہے۔ مرد کا دماغ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ ایک فوکس پر اپنی سوچ کو مرتکز کرسکے۔ جب کہ عورت کا دماغ فطری طور پر ایسا ہے کہ وہ بیک وقت مختلف چیزوں کے بارہ میں سوچے۔ اس بنا پر عورت کا فکری فوکس پھیل جاتا ہے۔ جب کہ مرد کا فکری فوکس محدود رہتا ہے۔ عورت اور مرد کے دماغ کا یہ فرق کسی بھی وقت اور کسی بھی مقام پر دونوں کا تجربہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے۔

اسی فطری فرق کی بنا پر یہ اصول رکھا گیا ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں تاکہ ایک عورت اگر اپنے فطری مزاج کی بنا پر معاملہ کو پوری طرح یاد نہ رکھ سکے تو دوسری عورت اس کی تلافی کر دے۔

۵۔ عورت اور مرد برابر

قرآن میں ایک مقام پر اہل ایمان کی دعا بتائی گئی ہے۔ اس دعا میں اہل ایمان نے اللہ تعالیٰ سے اُس کی رحمت اور نجات کے لیے درخواست کی ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا:

اُن کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ (آل عمران ۱۹۵)

قرآن کی اس آیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد دونوں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ تم سب ایک دوسرے سے ہو (you are members, one of another) کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا معاملہ یکساں ہے۔ چنانچہ آیت میں آگے دونوں کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ تم میں سے جن لوگوں نے ہجرت کی، جن کو وطن سے نکالا گیا، اور جن کو اللہ کے راستہ میں ستایا گیا اور جنہوں نے مخالف طاقتوں کا مقابلہ کیا تو ایسے لوگ خدا کی معافی اور جنت میں داخلہ کے مستحق قرار پائیں گے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اسلام میں عورت اور مرد دونوں کی اخلاقی ذمہ داریاں یکساں ہیں۔ اس لیے انعام اور جزاء کے معاملہ میں دونوں کا حصّہ یکساں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد دونوں کے حقوق بھی یکساں ہیں اور ذمہ داریاں بھی یکساں۔

۶۔ ایک خاندان کے افراد

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور خبر دار رہو قرابت والوں

سے۔ بے شک اللہ تمہاری نگرانی کررہا ہے۔ (النساء ۱)

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا کہ عورت اور مرد دونوں کی اصل ایک ہے۔ دونوں ایک ہی ماں باپ کی نسل ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بھائی اور بہن کی طرح ہیں۔ یہ تصور تمام اجتماعی اخلاقیات کا سرچشمہ ہے۔ جن لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے وہ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اُتنا ہی ضروری سمجھیں گے جتنا کہ وہ اپنے خاندان کے افراد کے لیے اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ تصور باہمی اتحاد کا سرچشمہ بھی ہے اور باہمی حسنِ اخلاق کا ایک طاقت ور محرک بھی۔

اس آیت میں **خلق منها زوجها** کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں منہا سے مراد **من جنسها** ہے۔ یعنی خدا نے جس مادہ سے آدم کو پیدا کیا، اسی مادہ سے حوا کو بھی پیدا کیا۔ اس تخلیقی اشتراک کا تقاضا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کامل اتحاد کے ساتھ رہیں۔

بائبل میں آیا ہے کہ خدا نے پہلے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس نے آدم کے جسم سے ایک پسلی نکال کر اس سے حوا (عورت) کو بنایا (پیدائش، باب ۲: ۲۲۔ ۲۳)۔ بائبل کے اس بیان کی بنیاد پر کچھ مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے، مگر یہ واضح طور پر بائبل کا بیان ہے، نہ کہ قرآن کا بیان۔ قرآن کے مطابق، آدم اور حوا دونوں کو ایک ہی مشترک مادہ سے پیدا کیا گیا، نہ کہ ایک کو دوسرے کے کسی جسمانی حصہ سے۔

حدیث میں آیا ہے کہ **خلقن من ضلع** (صحیح البخاری) یہ حدیث تمام عورتوں کے بارے میں ہے نہ کہ حوا کی تخلیق کے بارے میں۔ اس میں دراصل پسلی کی تمثیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ عورتیں مقابلۃً جذباتی (emotional) ہوتی ہیں اس لیے مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں سے معاملہ کرتے ہوئے ان کے اس مزاج کا لحاظ رکھیں۔

۷۔ تعدد ازواج

قرآن میں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں جو حکم آیا ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے: اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو عورتوں میں سے جو تم کو

پسند ہوں ان سے دودو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو۔ اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔ (النساء ۳)

قرآن کی اس آیت میں مردوں کو تعدد ازواج (polygamy) کی اجازت دی گئی ہے۔ اجازت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجازت اُس صورت حال کے لیے ہے جب کہ سماج میں یتیم لڑکوں اور یتیم لڑکیوں کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہو۔ گویا کہ یہ اجازت عام نہیں ہے بلکہ وہ اُس وقت کے لیے ہے جب کہ عورتیں سرپلس ہوگئی ہوں۔ یعنی کسی غیر معمولی حادثہ مثلاً جنگ کی وجہ سے سماج میں مردوں کی تعداد گھٹ جائے اور اُس کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے۔ ایسی حالت میں وقتی سماجی مسئلہ کے حل کے طور پر بطور استثناء یہ اجازت دی گئی کہ مرد بقدرِ ضرورت زیادہ شادیاں کر کے سماج میں معتدل ماحول قائم کریں۔

آیت میں ''دودو، اور تین تین، اور چار چار'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں ایک سے نکاح کا ذکر نہیں۔ اس اندازِ بیان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مرد کے لیے ایک عورت سے شادی کرنا معمول کی حالت ہے اور اس سے زیادہ تعداد میں شادی کرنا معمول کے خلاف حالت ہے۔ یہ معمول کے خلاف حالت صرف اس وقت قابل عمل ہوتی ہے جب کہ جنگ وغیرہ کی وجہ سے سماج میں عورت اور مرد کی تعداد کے درمیان غیر فطری طور پر نابرابری قائم ہوگئی ہو۔

۸۔ مرد اور عورت کے وراثتی حقوق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں سے مردوں کا بھی حصہ ہے اور ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں سے عورتوں کا بھی حصہ ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ، ایک مقرر کیا ہوا حصہ۔ (النساء ۷)

قرآن کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ اور دیگر قرابت والوں کے مال متروکہ میں سے مردوں یعنی بیٹوں کو خواہ وہ بچے ہوں یا جوان، اُن کا حصہ ملے گا اور عورتوں یعنی بیٹیوں کو بھی بالغ ہوں یا نابالغ، ماں باپ وغیرہ اقارب کے ترکہ میں سے اُن کا حصہ دیا جائے گا اور یہ حصے مقرر

کیے ہوئے ہیں جن کا دینا ضروری ہے خواہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ۔

قدیم زمانہ میں وراثت کے معاملہ میں بہت زیادہ ناانصافی ہوتی تھی۔ یا تو وارثوں کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا یا اس طرح مقرر کیا گیا تھا جس میں وارثوں کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوتا تھا۔ قرآن میں وارثوں کے حصہ کو باقاعدہ طور پر منصفانہ انداز میں مقرر کیا گیا۔

۹۔ ناپسندیدہ چیز میں خیر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی اپنی میراث میں لے لو اور نہ اُن کو اس غرض سے روکے رکھو کہ تم نے جو کچھ اُن کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ اُن سے لے لو مگر اس صورت میں کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کریں۔ اور ان کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔ (النساء ۱۹)

اس آیت میں خاندانی زندگی کا ایک اہم نکتہ بیان ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فطری طور پر فرق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کامیاب زندگی کا راز یہ ہے کہ لوگ آپس میں ایڈجسٹمنٹ کر کے رہیں۔ ازدواجی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ مختلف اسباب سے ایک اور دوسرے کے درمیان شکایت اور اختلاف کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو طرفین کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ میں نے رفیقِ زندگی کے انتخاب میں غلطی کی۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انتخاب کی غلطی نہیں ہے بلکہ یہ سوچ کی غلطی ہے۔ شوہر اور بیوی دونوں کو یہ جاننا چاہیے کہ اس دنیا میں نہ کوئی معیاری شوہر ہے اور نہ کوئی معیاری بیوی۔ ایسی حالت میں کامیاب ازدواجی زندگی کا راز یہ ہے کہ دونوں ''غیر معیاری'' رفیقِ زندگی کے ساتھ ایڈجسٹ کر کے رہنا سیکھیں۔

مزید یہ کہ یہ ایڈجسٹ منٹ کوئی برائی (evil) نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک نہایت اہم حکمت چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ ناموافق حالات کے ساتھ ایڈجسٹ کر کے رہنا، تمام انسانی ترقیوں کا زینہ

ہے۔ اسی سے مرد اور عورت کے درمیان اعلیٰ اخلاقیات کی پرورش ہوتی ہے۔ اسی سے مرد اور عورت کے درمیان اعلیٰ انسانی اوصاف کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اسی سے مرد وعورت کے اندر چھپے ہوئے امکانات (potentials) جاگتے ہیں۔ یہ صورت حال کسی انسان کی عائد کی ہوئی نہیں، وہ خود خالقِ فطرت کی تخلیق کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس معاملہ میں کسی مرد یا عورت کے لیے اس کے سوا کوئی انتخاب (choice) نہیں کہ وہ اُس کو قبول کرے۔

۱۰۔ازدواجی رشتہ کا اُصول

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تمہارے اوپر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا، تمہاری دودھ شریک بہنیں، تمہاری عورتوں کی مائیں اور اُن کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جو تمہاری اُن بیویوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے، لیکن اگر ابھی تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمہارے صُلبی بیٹوں کی بیویاں اور یہ کہ تم اکھٹا کرو دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (النساء ۲۳)

اسلام میں نکاح کے لیے کچھ رشتے حلال ہیں اور کچھ رشتے حرام۔ جن عورتوں سے رشتہ حرام ہے اُن کی چند قسمیں ہیں۔ جو نسبی تعلق کی وجہ سے حرام ہیں وہ سات ہیں، ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، اُن میں سے کسی کے ساتھ کسی کو نکاح کرنا جائز نہیں۔ ماں کے حکم میں دادی، نانی اوپر تک کی سب داخل ہیں اور بہن میں عینی، علاّتی اور اخیافی سب داخل ہیں اور پھوپھی میں باپ دادا اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سگی ہوں یا سوتیلی سب شامل ہیں۔ اور خالہ میں ماں اور نانی اور نانی کی نانی، سب کی بہن تینوں قسم کی داخل ہیں۔ اور بھتیجی میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد سب داخل ہیں اور بھانجی میں تینوں قسم کی بہنوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد داخل ہیں۔

اسی طرح رضاعت کی بنیاد پر بھی کچھ رشتے حرام ہیں۔ اور وہ دو ہیں: ماں اور بہن۔ یہ ساتوں رشتے جو نسب میں بیان ہوئے رضاعت میں بھی حرام ہیں۔ یعنی رضاعی بیٹی اور پھوپھی اور

خالہ اور بھتیجی اور بھانجی بھی حرام ہیں۔ اسی طرح مصاہرت کی بنیاد پر بھی نکاح حرام ہوتے ہیں۔ اس حرمت کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ کہ اُن سے ہمیشہ کے لیے نکاح ناجائز ہے اور وہ زوجہ کی ماں اور اُس زوجہ کی بیٹی ہے جس زوجہ سے تم نے صحبت کی ہو۔ لیکن اگر صحبت سے پہلے کسی عورت کو طلاق دے دو تو اُس کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے اور تمہارے بیٹوں کی عورتیں ہیں اور اُس میں نیچے تک کے پوتوں اور نواسوں کی عورتیں داخل ہیں کہ ان سے کبھی نکاح درست نہیں ہو سکتا۔ دوسری قسم وہ ہے کہ اُن سے ہمیشہ کے لیے نکاح کی ممانعت نہ ہو بلکہ جب تک کوئی عورت تمہارے نکاح میں رہے اُس وقت تک اُس عورت کی اُن قرابت والی عورتوں سے نکاح کی ممانعت رہے، جب اُس عورت کو طلاق دے دی یا وہ مر جائے تو اُن سے نکاح درست ہو جائے گا۔ اور وہ زوجہ کی بہن ہے کہ زوجہ کی موجودگی میں تو اُس سے نکاح نہیں ہو سکتا اور بعد میں درست ہے۔ اور یہی حکم ہے زوجہ کی پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی کا۔ (تفسیر عثمانی)

۱۱۔ بہتر تعلقات

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تم ایسی چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لیے حصہ ہے اپنی کمائی کا اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اپنی کمائی کا۔ اور اللہ سے اُس کا فضل مانگو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (النساء ۳۲)

عورت اور مرد دونوں کے درمیان دنیوی اعتبار سے مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی خصوصیات میں کم حصہ ملا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کوئی اچھے حالات میں پیدا ہوتا ہے اور کوئی بُرے حالات میں۔ کسی کے پاس بڑے بڑے ذرائع ہیں اور کسی کے پاس معمولی ذرائع۔ عورت ہو یا مرد جب کوئی کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے اندر دوسرے کے خلاف جلن کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسد، عداوت اور باہمی کش مکش جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ان چیزوں کے اعتبار سے اپنے یا دوسرے کو تولنا نادانی ہے۔ یہ سب دنیوی اہمیت کی چیزیں ہیں۔ یہ دنیا میں ملی ہیں اور دنیا ہی میں رہ جانے والی ہیں۔ اصل اہمیت عورت اور مرد دونوں کے

لیے آخرت کی کامیابی کی ہے اور آخرت کی کامیابی میں ان چیزوں کا کچھ بھی دخل نہیں۔ آخرت کی کامیابی کا انحصار اس عمل پر ہے جس کو عورت یا مرد ارادہ و اختیار سے اللہ کے لیے کرتے ہیں۔ اس لیے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں حسد سے اپنے آپ کو بچائیں اور اللہ سے توفیق کی دعا کرتے ہوئے اپنے آپ کو آخرت کے لیے عمل کرنے میں لگا دیں۔

۱۲۔ قوامیت کا اُصول

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: مرد عورتوں کے اوپر قوّام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کیے۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، پیٹھ پیچھے نگہبانی کرتی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔ اور جن عورتوں سے تم کو نشوز کا اندیشہ ہو، اُن کو سمجھاؤ اور اُن کو اُن کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور اُن کو مارو۔ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو اُن کے خلاف الزام کی راہ نہ تلاش کرو۔ بے شک اللہ سب سے اوپر ہے، بہت بڑا ہے۔ (النساء ۳۴)

اسلام کے مطابق، خاندانی نظام میں مرد کو عورت کے اوپر قوّام بنایا گیا ہے۔ یہ معروف معنوں میں کوئی فضیلت یا برتری کی بات نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خاندان کے معاملات میں مرد کو اصولی طور پر منتظم کی حیثیت حاصل ہے۔ قوّامیت دراصل انتظامیت (مینجمنٹ) کا مسئلہ ہے، نہ کہ ایک کے اوپر دوسرے کی حاکمیت کا مسئلہ۔ انتظامی ضرورت کے تحت اس قسم کا سٹل منٹ ہر ادارہ میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً کمپنی میں ایک افسر، حکومت میں ایک وزیر اعظم، میٹنگ میں ایک چیرمین، ادارہ میں ایک ڈائرکٹر، وغیرہ۔ اس قسم کا تقرر صرف انتظامی ضرورت کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ امتیازی درجہ بندی کے لیے۔

مذکورہ آیت میں واضربوھن (اُن کو مارو) کا لفظ مارنے (beating) کے معنیٰ میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ تنبیہہ (warning) کے معنٰی میں ہے۔ اس سے مراد دراصل وہ اصلاحی عمل ہے جس کو خیر خواہانہ تنبیہہ یا مشفقانہ تنبیہہ کہا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں ضرب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر شوہر کو یہ

حق ہے کہ وہ اپنی بیوی کو مارے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا۔ جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اسلام کی کئی بیویاں تھیں۔ ان بیویوں نے کئی بار مسائل بھی پیدا کئے۔ مگر پیغمبر اسلام نے کبھی ان میں سے کسی کو نہیں مارا۔

۱۳۔ ثالثی کا اُصول

خاندانی زندگی میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے حل کا ایک فطری اصول قرآن میں بتایا گیا ہے۔ قرآن کا یہ اصول اس آیت میں ملتا ہے:

اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک حَکَم عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان موافقت کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔ (النساء ۳۵)

حَکَم (ثالثی) کا یہ اُصول نزاعات کے حل کے لیے بے حد مفید ہے۔ دو آدمیوں میں جب باہمی اختلاف ہو تو دونوں کا ذہن ایک دوسرے کے بارہ میں متاثر ذہن بن جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بارہ میں خالص واقعاتی انداز سے سوچ نہیں پاتے۔ ایسی حالت میں معاملہ کو طے کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں اپنے سوا کسی دوسرے کو حَکَم (arbiter) بنانے پر راضی ہو جائیں۔ دوسرا شخص معاملہ سے ذاتی طور پر وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے گا اور ایسے فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہو۔

۱۴۔ یکساں انعام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور اُن پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ النساء، ۱۲۴

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عملِ صالح کے انعام میں اللہ تعالیٰ کے یہاں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ خدا کا ایک ہی قانونِ جزاء دونوں صنفوں کے لیے ہے۔ جو کوئی بھی

سچے ایمان باللہ کا ثبوت دے اور حقیقی معنوں میں نیک عمل کرے وہ یکساں طور پر ابدی جنت کا مستحق قرار پائے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

۱۵۔ آدم اور حوا

قرآن میں ابتدائی انسان (آدم اور حوا) کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور اے آدم، تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ جہاں سے چاہو۔ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو بہکایا تاکہ وہ کھول دے دونوں کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اُس نے دونوں سے کہا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتہ نہ بن جاؤ یا تم دونوں کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے۔ اور اُس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ پس مائل کر لیا اُن دونوں کو فریب سے۔ پھر جب دونوں نے درخت کا پھل چکھا تو دونوں کی شرمگاہیں اُن پر کھُل گئیں اور دونوں اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ اور ان کے رب نے اُن کو پکارا کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھُلا ہوا دشمن ہے۔ اُن دونوں نے کہا، اے ہمارے رب، ہم دونوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم دونوں کو معاف نہ کرے اور ہم دونوں پر رحم نہ کرے تو ہم دونوں گھاٹا اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ الأعراف، ۱۹۔۲۳

قرآن کے اس بیان میں بار بار تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اُس کا ایک خاص سبب ہے۔ اصل یہ ہے کہ بائبل میں یہ کہا گیا ہے کہ جنت میں جب آدم اور حوا کو بسایا گیا تو حوّا نے آدم کو بہکایا اور حوّا کے کہنے سے آدم نے ممنوعہ درخت کے معاملہ میں خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ قرآن کے مذکورہ بیان میں تثنیہ کے صیغے اسی کی تردید کے لیے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہکانے والا دراصل شیطان تھا، نہ کہ حوّا۔ شیطان نے بیک وقت دونوں کو بہکایا اور دونوں ہی مشترک طور پر اُس کے بہکاوے میں آ گئے۔ قرآن کے اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا معاملہ بالکل

یکساں ہے۔ دونوں ہی نے مشترک طور پر غلطی کی اور پھر دونوں ہی نے مشترک طور پر توبہ کر کے دوبارہ اللہ کی رحمت حاصل کی۔

۱۶۔ مومن اور مومنات

قرآن میں مرد اور عورت دونوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے باغوں کا کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وعدہ ہے، ستھرے مکانوں کا، ہمیشگی کے باغوں میں، اور اللہ کی رضامندی جو سب سے بڑھ کر ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ (التوبہ ۷۱-۷۲)

قرآن کے اس بیان میں مومن مرد اور مومن عورت دونوں کا ذکر یکساں حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی حیثیت میں بھی دونوں سے اسلام کا تقاضا یکساں ہے۔ اسی طرح اجتماعی حیثیت سے بھی دونوں سے یکساں عمل مطلوب ہے۔ اس اجتماعی پہلو کا اشارہ قرآن کے ان الفاظ میں ملتا ہے کہ: **بعضهم اولياء بعض** (التوبہ ۷۱)

اسی طرح قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا معاملہ آخرت کے اعتبار سے بھی یکساں ہے۔ جو عمل ایک مرد کو جنت میں داخلہ کا استحقاق دے گا، اُسی عمل سے عورت بھی جنت میں داخلہ کی مستحق قرار پائے گی۔

۱۷۔ نئی نسل کی تیاری

قرآن میں حضرت ابراہیم کی ایک دعا نقل کی گئی ہے۔ یہ دعا اُنھوں نے اُس وقت کی تھی جب کہ اُنھوں نے عرب کے صحرا میں اپنی زوجہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو لا کر بسا دیا تھا۔ وہ دعا یہ تھی: اور جب ابراہیم نے کہا، اے میرے رب، اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور

رکھ کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کردیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک بے کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دل اُن کی طرف مائل کردے اور اُن کو پھلوں کی روزی عطا فرما۔ تاکہ وہ شکر کریں۔ (ابراہیم ۳۵۔۳۷)

یہ دعا ایک عظیم تاریخ کی یاد دلاتی ہے۔ یہ عظیم تاریخ ایک خاتون کے ذریعہ بنائی گئی جن کا نام ہاجرہ تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں شرک ہر طرف غالب آ گیا تھا۔ انسانی سماج پوری طرح مشرکانہ کلچر کے تابع ہو چکا تھا۔ ہر بچہ جو اس سماج میں پیدا ہوتا وہ مشرکانہ افکار کے تحت کنڈیشنڈ (conditioned) ہو جاتا تھا۔

اُس وقت اللہ کے حکم کے تحت حضرت ابراہیم نے یہ کیا کہ اپنی زوجہ اور اپنے چھوٹے بیٹے کو مشرکانہ آبادیوں سے دور ایک ویرانہ میں لے جا کر بسا دیا۔ یہاں فطرت کا سادہ ماحول تھا۔ یہاں مشرکانہ تمدن کے تحت کنڈیشننگ (conditioning) کا امکان موجود نہ تھا۔ اس بے آمیز ماحول میں ایک نئی نسل بنی جو مکمل طور پر اپنی خداداد فطرت پر قائم تھی۔ یہ وہی نسل ہے جو بنو اسماعیل کے نام سے تاریخ میں یاد کی جاتی ہے۔ اسی نسل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور اسی نسل سے آپ کو وہ قیمتی افراد ملے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے توحید کی پیغمبرانہ دعوت کو فکری مرحلہ سے بلند کر کے ایک مکمل انقلاب تک پہنچایا۔

ہاجرہ کا یہ واقعہ تمام عورتوں کے لیے ایک تاریخی نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نمونہ یہ ہے کہ ہر عورت کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ بہتر انسان بنائے۔ وہ ہر ایک نسل کے بعد دوسری نسل کی تیاری کا کام کرے۔ وہ انسانی سماج کو مسلسل طور پر بہتر انسان فراہم کرتی رہے۔

۱۸۔ حیات طیبہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص کوئی نیک کام کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ

مومن ہو تو ہم اس کو زندگی دیں گے، ایک اچھی زندگی۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم اُن کو بہترین بدلہ دیں گے۔ (النحل ۹۷)

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں عورت اور مرد دونوں کی حیثیت بالکل یکساں ہے۔ دونوں کے لیے عمل کا ایک ہی معیار ہے۔ دونوں کے لیے دنیا میں خدا کی رحمت اور آخرت میں خدا کے عذاب سے نجات کا فیصلہ ایک ہی اُصول کے تحت ہوگا۔ دونوں کے بارہ میں خدا کا قانون عمل کی بنیاد پر ہے، نہ کہ جنس کی بنیاد پر۔

۱۹۔ اشاعت فاحشہ نہیں

اسلام کے مدنی دور میں پیغمبر اسلام کی زوجہ عائشہ بنت ابی بکر پر ایک جھوٹا اخلاقی الزام لگایا گیا۔ اس الزام کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ مگر مدینہ کے بعض افراد نے جب اس کا تذکرہ کیا تو لوگ بے تکلف اس کا چرچا کرنے لگے۔ جو سنتا وہ اُس کو دوسرے سے بیان کرتا۔ اس پر قرآن میں مختلف احکام اُترے۔ ان میں سے ایک حکم یہ تھا:

جب تم لوگوں نے اس کو سُنا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے۔ پس جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت نہ ہوتی تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے اس کے باعث تم پر کوئی بڑی آفت آجاتی۔ جب کہ تم اُس کو اپنی زبانوں سے نقل کر رہے تھے۔ اور اپنے منھ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کا تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ اور تم اس کو ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ حالاں کہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے۔ اور جب تم نے اس کو سنا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منھ سے نکالیں۔ معاذ اللہ، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ (النور ۱۲۔۱۶)

قرآن کے اس بیان سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب بھی ایسا ہو کہ کسی مرد یا عورت کے بارہ میں کوئی غیر اخلاقی بات کہی جائے تو ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ

لوگ اُس کو صرف سن کر مان لیں اور پھر اُس کا تذکرہ کرنے لگیں۔ سُنی ہوئی بات کا بلاثبوت تذکرہ کرنا خود تذکرہ کرنے والے کو خدا کی نظر میں مجرم ثابت کرتا ہے۔ اس کے بجائے سننے والے کو یہ کرنا چاہیے کہ جب کہنے والے نے اپنی بات کے ساتھ اس کا پختہ ثبوت نہ دیا ہو تو صرف سُن کر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جھوٹی بات ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کے بارہ میں اچھی بات کہے تو اس کے لیے اُسے کوئی ثبوت یا گواہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جب وہ کسی کے بارہ میں ایک اخلاقی برائی کا ذکر کرے تو اس کو لازماً چار گواہ پیش کرنا ہوگا، ایسے چار گواہ جنہوں نے براہ راست طور پر مذکورہ اخلاقی برائی کو خود دیکھا اور سنا ہو۔ جو لوگ کسی کے بارے میں اس قسم کی اخلاقی برائی کا چرچا کریں اور اُس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش نہ کرسکیں تو وہ سخت مجرم قرار پائیں گے اور اسلامی ریاست میں اُنہیں کوڑا مارنے کی سزا دی جائے گی۔

۲۰۔ پردہ کا قانون

قرآن میں خواتین کے لیے پردہ کا قانون بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔ مگر جو اس میں سے ظاہر ہو جائے اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہیں۔ اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنے مملوک پر یا زیردست مردوں پر جو کچھ غرض نہیں رکھتے۔ یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے ابھی ناواقف ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زور سے نہ ماریں کہ اُن کی مخفی زینت معلوم ہو جائے اور اے ایمان والو، تم سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (النور ۳۱)

قرآن کی ان آیتوں میں خواتین کے پردہ کا وہ حکم بتایا گیا ہے جس کو سَتر کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے جسم کے کس حصہ کا چھپانا ضروری ہے اور کس حصہ کو کھولنے کی اجازت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کا پورا بدن ڈھیلے اور سادہ کپڑوں سے ملبوس ہونا چاہیے۔ تاہم اس کلیّہ میں بربنائے ضرورت ایک استثناء

ہے۔ یہ استثناء آیت کے لفظ **إلا ما ظهر منها** سے نکلتا ہے۔ سورہ النور کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

''حدیث و آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ چہرہ اور کفین (ہتھیلیاں) **الا ما ظهر منها** میں داخل ہیں۔ کیوں کہ بہت سی ضروریات دینی و دنیوی اُن کے کھُلا رکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر ان کے چھپانے کا مطلقاً حکم دیا جائے تو عورتوں کے لیے کاروبار میں سخت تنگی اور دشواری پیش آئے گی۔ آگے فقہاء نے قدمین کو بھی ان ہی اعضاء پر قیاس کیا ہے اور جب یہ اعضا مستثنیٰ ہوئے تو اُن کے متعلقات مثلاً انگوٹھی، چھلّا یا مہندی، کاجل، وغیرہ کو بھی استثناء میں داخل ماننا پڑے گا۔ لیکن واضح رہے کہ الا ما ظہر منہا سے صرف عورتوں کو بضرورت اُن کے کھلا رکھنے کی اجازت ہوئی''۔

تفسیر القرآن العظیم، مطبوعہ کراچی، صفحہ ۴۵۸۔۴۵۹، تفسیر سورہ والنور

۲۱۔ متقیوں کی امامت

قرآن میں اہل جنت کی کچھ صفات بتائی گئی ہیں۔ یعنی وہ صفتیں جن کی بنا پر کوئی شخص جنت میں داخلہ کا مستحق قرار پائے گا۔ اہل جنت کی ان صفتوں میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان والوں کے لیے خدا سے یہ دعا کرتے ہیں:

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو ہماری بیوی اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ (الفرقان ۷۴)

اس دعا کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی — اے خدا، میرے دل کی ٹھنڈک تقویٰ میں ہے۔ اے خدا، تو میرے بیوی اور بچوں کو متقی بنا تا کہ اُن کو دیکھ کر میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ میرا خاندان متقیوں کا خاندان بن جائے۔

ایک ماں اور ایک باپ، اگر وہ سچے خدا پرست ہیں تو اُن کو اس میں خوشی نہیں ہو سکتی کہ اُن کے بچّے مادی چمک دمک میں جیتے ہوں۔ بلکہ اُن کی خوشی اس میں ہوگی کہ اُن کے بچّے خدا سے ڈرنے

والے ہوں۔ وہ خدا کے حکم کے مطابق، اپنی زندگی گذاریں۔ ایسا ہی خاندان حقیقی معنوں میں خدا پرست خاندان ہے۔ اور وہ ماں اور باپ خوش قسمت ہیں جو ایسے خدا پرست خاندان کے سر پرست بنے ہوئے ہوں۔

۲۲۔ سیاسی ٹکراؤ نہیں

قرآن میں ملکۂ سبا کا ذکر ہے۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہم عصر تھی۔ یمن کے ساحلی علاقہ پر اس کی حکومت قائم تھی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہُدہُد فلسطین کے علاقہ سے اُڑ کر یمن کے علاقہ تک پہنچا۔ پھر واپس آ کر اُس نے ملکۂ سبا اور اُس کی قوم کو خبر دی۔ اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنا ایک خط لے کر ہُدہُد کے ذریعہ ملکۂ سبا کی طرف روانہ کیا۔ اس سلسلہ میں قرآن کا بیان یہ ہے:

(سلیمان نے کہا کہ) میرا یہ خط لے کر جاؤ۔ پھر اس کو ان لوگوں کی طرف ڈال دو۔ پھر اُن سے ہٹ جانا۔ پھر دیکھنا کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ ملکۂ سبا نے کہا کہ اے دربار والو، میری طرف ایک باوقعت خط ڈالا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے۔ اور وہ ہے—— شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے کہ تم میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس آ جاؤ۔ ملکہ نے کہا کہ اے درباریو، میرے معاملہ میں مجھے رائے دو۔ میں کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم لوگ موجود نہ ہو۔ اُنہوں نے کہا، ہم لوگ زور آور ہیں اور سخت لڑائی والے ہیں اور فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔ پس آپ دیکھ لیں کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں۔ ملکہ نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو خراب کر دیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور یہی یہ لوگ کریں گے۔ (النحل ۲۸۔۳۴)

قرآن کی ان آیات میں ایک خاتون کی زبان سے یہ بتایا گیا ہے کہ سیاسی اختلاف کے معاملہ میں صحیح پالیسی کیا ہے۔ جب ایسا ہو کہ یہ اختلاف دو ایسے سیاسی گروہوں کے درمیان ہو جن

میں سے ایک نسبتاً کمزور ہو اور دوسرا نسبتاً زیادہ طاقت ور ہو تو ایسی حالت میں صحیح پالیسی یہ ہے کہ ٹکراؤ کو اوائڈ کیا جائے۔ کیوں کہ اس طرح کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک گروہ کی یک طرفہ تباہی پر ختم ہوتا ہے۔ ایسے ٹکراؤ میں صرف یہ نہیں ہوتا کہ دولڑنے والی فوجیں ایک دوسرے کو قتل کریں۔ بلکہ اس قتال کے دوران بے گناہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں۔ اور عزت والے لوگ بے عزت کیے جاتے ہیں۔

یہ معاملہ اتنا عام ہے کہ مذکورہ آیت کے مطابق، اگر حضرت سلیمان مُلکِ سبا پر حملہ کرتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔ چنانچہ یہاں قرآن میں **وکذلك يفعلون** (النمل ۳۴) یعنی وہ بھی ایسا ہی کریں گے، کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایسی حالت میں صحیح پالیسی وہی ہے جو ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان کے مقابلہ میں اختیار کی — یعنی ٹکراؤ کو اوائڈ کرنا اور مصالحت کے ذریعہ اپنے قومی مفادات کو محفوظ رکھنا۔

۲۳۔ عورت کا میدانِ کار

قرآن میں حضرت موسیٰ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس قصہ کا ایک جزء یہ ہے کہ اُنہیں بعض اسباب سے مُلک مصر چھوڑنا پڑا۔ وہ یہاں سے مدین کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک مقام پر یہ واقعہ گذرا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک بزرگ کی دولڑکیاں ایک مقام پر آپ کو ملیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کا بیان یہ ہے:

اور جب موسیٰ مدین کے چشمہ پر پہنچا تو وہاں لوگوں کی ایک جماعت کو پانی پلاتے ہوئے پایا۔ اور اُن سے الگ ایک طرف دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بکریوں کو روکے ہوئے کھڑی ہیں۔ موسیٰ نے اُن سے پوچھا کہ تمہارا کیا ماجرا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنی بکریاں ہٹا نہ لیں۔ اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے تو موسیٰ نے ان کے جانوروں کو پانی پلایا۔ پھر وہ سائے کی طرف ہٹ گیا۔ پھر کہا کہ اے میرے رب، تو جو چیز میری طرف اُتارے میں اُس کا محتاج ہوں۔ پھر ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک آئی شرم سے چلتی ہوئی۔

اُس نے کہا کہ میرا باپ آپ کو بُلا رہا ہے کہ آپ نے ہماری خاطر جو پانی پلایا اُس کا آپ کو بدلہ دے۔ پھر جب وہ اُس کے پاس آیا اور اُس سے سارا قصہ بیان کیا تو اُس نے کہا کہ اندیشہ نہ کرو تم نے ظالموں سے نجات پائی۔ ان میں سے ایک لڑکی نے کہا کہ اے باپ، اس کو ملازم رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

(القصص ۲۳۔۲۶)

مذکورہ دونوں لڑکیاں مومنہ تھیں۔ وہ ایک اسرائیلی بزرگ کی لڑکیاں تھیں۔ نیز یہ کہ اُس وقت وہ غیر شادی شدہ تھیں۔ اس خاندان کی معاش کا ذریعہ مویشی پالنا تھا۔ یہ لڑکیاں روزانہ صبح کو اپنی بکریاں چرانے کے لیے اُن کو گھر سے دور لے جاتیں اور پھر شام کو پانی پلا کر اُنہیں گھر واپس لاتیں۔ اسی کے ساتھ یقیناً وہ دوسرے متعلق کام کرتی تھیں۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے دین میں عورتوں کو گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت ہے۔ اس معاملہ میں اُن پر کوئی روک نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ خواتین خدا کے دین کی بتائی ہوئی حدود کی پابند ہوں۔ وہ بے قید ہو کر یہ کام نہ کریں بلکہ ضروری حدود و قیود کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا کام انجام دیں۔

۲۴۔ ماں اور باپ کے حقوق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے معاملہ میں تاکید کی۔ اُس کی ماں نے دُکھ پر دُکھ اُٹھا کر اُس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا۔ کہ تو میرا شکر کر اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جو تجھ کو معلوم نہیں تو اُن کی بات نہ ماننا۔ اور دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا۔ اور تم اس شخص کے راستہ کی پیروی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے۔ (لقمان ۱۴۔۱۵)

قرآن میں جو تعلیمات آئی ہیں ان میں خدا کے حق کے بعد سب سے زیادہ حق ماں اور باپ کا

بتایا گیا ہے۔ حدیث کے مطابق، ماں کا حق باپ سے بھی زیادہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حق دراصل احسان کا اعتراف ہے۔ خدا کا احسان عورت اور مرد کے اوپر سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے خدا کے حقوق بھی سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے بعد کسی آدمی کے اوپر اس کے ماں باپ کا احسان ہوتا ہے جو اس کو بالکل بچپن سے پالتے ہیں۔ احسان کا اعتراف بلاشبہہ سب سے بڑی نیکی (virtue) ہے۔ اس نیکی کا اظہار سب سے پہلے خدا کے اوپر ہوتا ہے، اور اس کے بعد ماں باپ کے اوپر۔

تاہم انسان کو چاہیے کہ وہ دو چیزوں کے درمیان فرق کرے۔ ایک ہے، ماں اور باپ کی خدمت کرنا، اور دوسری چیز ہے، ماں اور باپ کے حکم کی اطاعت کرنا۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق، ماں اور باپ کی خدمت تو مطلق قسم کا اخلاقی فرض ہے۔ مگر جہاں تک اطاعت کا تعلق ہے تو اطاعت صرف درست کام میں کی جائے گی، غلط کام میں اُن کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

۲۵۔ عورت کی ذمہ داری

قرآن میں ازواجِ رسول کی ذمہ داریاں بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اے پیغمبر کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرو تو تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ لالچ میں پڑ جائے اور معروف کے مطابق بات کہو۔ اور تم اپنے گھر میں قرار سے رہو اور سابقہ جاہلیت کی طرح دکھلاتی نہ پھرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو چاہتا ہے کہ وہ تم اہل بیت سے آلودگی کو دور کرے اور تم کو پوری طرح پاک کر دے۔ (الأحزاب ۳۲۔۳۳)

قرآن کا یہ بیان بظاہر پیغمبر کی ازواج کے بارہ میں ہے۔ مگر اپنے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے وہ ان تمام خواتین کے بارے میں ہے جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے ساتھ سماجی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا بھی جذبہ رکھتی ہوں اور اس بنا پر ان کا تعلق (interaction) مردوں سے بھی پیش آتا ہو۔ یہ خواتین وہ ہیں جو اپنے حالات اور اپنی صلاحیت کے لحاظ سے قیادت کی ذمہ داریاں ادا کرتی ہیں۔ ان آیات میں ان خواتین کو بتایا گیا ہے کہ اُنھیں کس قسم کے آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ایسی خواتین کے لیے

ضروری ہے کہ وہ اپنی نسوانی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ اس معاملہ میں وہ توازن کو نہ کھوئیں۔

۲۶۔ گھر ایک تعلیم گاہ

قرآن میں ازواجِ رسول کی ذمہ داریوں کو بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا تذکرہ کرو۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، خبر رکھنے والا ہے۔ (الاحزاب ۳۴)

قرآن کی اس آیت کا خطاب بظاہر ازواجِ رسول سے ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک عمومی حکم کو بتاتی ہے۔ ازواجِ رسول کی حیثیت اس معاملہ میں ماڈل خواتین کی ہے۔ اُن کی زندگی امت کی دوسری خواتین کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ازواجِ رسول کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ پیغمبر سے جو دینی احکام اور حکمت کی باتیں سنتی ہیں اُن کو نہ صرف خود گہرائی کے ساتھ قبول کریں بلکہ اُن کو دوسرے لوگوں تک بھی پہنچائیں۔ اس آیت سے اسلام کی یہ اسپرٹ معلوم ہوتی ہے کہ ہر مسلم گھر کو ایک تعلیم گاہ بنا دیا جائے جس کی انچارج گھر کی خاتون ہو۔ گھر پورے سماج کا ایک یونٹ ہے۔ اگر ہر یونٹ اس اعتبار سے تعمیری رول ادا کرے تو پورا سماج ایک تعمیری سماج بن جائے گا۔

۲۷۔ خدا پرست عورتوں کی صفات

قرآن میں خدا پرست مردوں اور خدا پرست عورتوں کی صفات بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:
بے شک اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں۔ اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں۔ اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں۔ اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں۔ اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں۔ اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں۔ اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی

عورتیں—ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے۔ اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔ (الاحزاب ۳۵-۳۶)

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مرد یا ایک عورت کو جیسا دیکھنا چاہتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ حسب ذیل دس صفات ہیں—اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، روزہ، عفت، ذکر اللہ۔

ان دس الفاظ میں اسلامی عقیدہ اور اسلامی کردار کے تمام پہلو سمٹ آئے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ کے یہاں مغفرت اور انعام کا امیدوار ہو اس کو ایسا بننا چاہیے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے حکم کے آگے جھکنے والا ہو۔ وہ اللہ پر یقین رکھنے والا ہو۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کے لیے یکسو ہو جائے۔ اس کی زندگی قول اور فعل کے تضاد سے خالی ہو۔ وہ ہر حال میں سچائی پر قائم رہنے والا ہو۔ اللہ کی بڑائی کے احساس نے اسے متواضع بنا دیا ہو۔ وہ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کو بھی اپنی ذمہ داری شمار کرتا ہو۔ وہ روزہ دار ہو جو نفس کو کنٹرول کرنے کی تربیت ہے۔ وہ شہوانی خواہشات کے مقابلہ میں عفیف اور پاک دامن ہو۔ اس کے صبح و شام اللہ کی یاد میں بسر ہونے لگیں۔

یہ اوصاف جس طرح مردوں سے مطلوب ہیں اسی طرح وہ عورتوں سے بھی مطلوب ہیں۔ ان اوصاف کے اظہار کا دائرہ بعض اعتبار سے دونوں کے درمیان مختلف ہے۔ مگر جہاں تک خود اوصاف کا تعلق ہے وہ دونوں کے لیے یکساں ہے۔ کوئی عورت ہو یا کوئی مرد وہ اسی وقت خدا کے یہاں قابلِ قبول ٹھہرے گا جب کہ وہ ان دس صفتوں سے متصف ہو کر خدا کے یہاں پہنچے۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں ان اوصاف پر قائم رہنے کی ضمانت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر عورت اور ہر مرد اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو اپنے لیے لازم کر لے۔ جب بھی اپنی خواہش اور

خدا کے حکم کے درمیان انتخاب کا سوال ہو تو وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ خدا اور رسول کے حکم کو لے لے اور ذاتی خواہش کو نظرانداز کردے۔

۲۸۔ زندگی ایک امانت ہے

قرآن کے مطابق، زندگی ایک امانت ہے، مرد کے لیے بھی اور عورت کے لیے بھی۔ موجودہ دنیا میں ہر ایک کا یہی امتحان ہے کہ وہ اس امانت الٰہی میں پورا اُترے۔ اسی پر ہر مرد اور ہر عورت کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کا بیان یہ ہے:

ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو اُنہوں نے اس کو اُٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اُٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ تا کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے۔ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر توجہ فرمائے۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ (الاحزاب ۷۲۔۷۳)

امانت سے مراد اختیار ہے۔ اختیار کو امانت اس لیے فرمایا کہ وہ اللہ کی ایک چیز ہے جس کو اُس نے عارضی مدت کے لیے انسان کو بطور آزمائش دیا ہے تا کہ انسان خود اپنے ارادہ سے خدا کا تابعدار بنے۔ امانت، دوسرے لفظوں میں، اپنے اوپر خدا کا قائم مقام بننا ہے۔ اپنے آپ پر وہ کرنا ہے جو خدا ستاروں اور سیاروں پر کر رہا ہے۔ یعنی اپنے اختیار سے اپنے آپ کو خدا کے کنٹرول میں دے دینا۔

اس کائنات میں صرف اللہ حاکم ہے اور تمام چیزیں اس کی محکوم ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ وہ ایک ایسی آزاد مخلوق پیدا کرے جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے وہی کرے جو خدا اس سے کروانا چاہتا ہے۔ یہ اختیاری اطاعت بڑی نازک آزمائش تھی۔ آسمان اور زمین اور پہاڑ بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتے۔ تاہم انسان نے شدید اندیشہ کے باوجود اس کو قبول کرلیا۔ اب انسان موجودہ دنیا میں خدا کی ایک امانت کا امین ہے۔ اس کو اپنے اوپر وہی کرنا ہے جو خدا دوسری چیزوں پر کر رہا ہے۔ انسان کو اپنے آپ پر خدا کا حکم چلانا ہے۔ انسان حالتِ امتحان میں ہے اور موجودہ دنیا اس کے لیے وسیع امتحان گاہ۔

یہ امانت ایک بے حد نازک ذمہ داری ہے۔ کیوں کہ اسی کی وجہ سے جزا و سزا کا مسئلہ پیدا ہوتا

ہے۔ دوسری مخلوقات مجبور و مقہور ہیں۔ اس لیے اُن کے واسطے جزا و سزا کا مسئلہ نہیں۔ انسان آزاد ہے۔اس لیے وہ جزاوسزا کا مستحق بنتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق کے آغاز کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إنی جاعل فی الأرض خلیفة** (البقرہ ۳۰) اس آیت کی تشریح کچھ لوگوں نے یہ کی ہے کہ: **خلیفة یخلفنی فی تنفیذ احکامی علی الأرض** ۔مگر مذکورہ آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی زیادہ صحیح تفسیر یہ نظر آتی ہے کہ: **خلیفة یخلفنی فی تنفیذ احکامی علی نفسه** ۔یعنی وہ خدا کے احکام کو خدا کی طرف سے اپنے آپ پر نافذ کرے گا۔ گویا تنفیذ احکام کا محل خود انسان کی اپنی ذات ہے، نہ کہ خارجی معنوں میں زمین۔

اس خدائی منصوبہ کا تعلق عورت اور مرد دونوں سے ہے۔ اس کے نتیجہ میں عملاً مردوں اور عورتوں کی تین تقسیم واقع ہوگی۔ ایک وہ لوگ جو جانچ میں سچے مومن ٹھہریں۔ دوسرے وہ لوگ جو اس جانچ میں کھُلے طور پر ناکام ہوجائیں۔ تیسرا گروہ منافقین کا ہے۔یعنی وہ لوگ جو زبان سے ایمان کا اقرار کریں مگر وہ اپنی عملی زندگی کو خدائی حکم کے بجائے دنیوی مفادات کے تابع بنائے رہیں۔

۲۹۔ ماں کا کردار

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اورہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے۔اس کی ماں نے تکلیف کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ اُس کو جَنا۔اور حمل میں رہنا اس کا اور اُس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو وہ کہنے لگا کہ اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ اور میری اولاد میں بھی مجھ کو نیک اولاد دے۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور اُن کی برائیوں سے درگذر کریں گے، وہ اہل جنت میں سے ہوں گے، سچا وعدہ جو اُن سے کیا جاتا تھا۔(الاحقاف ۱۵۔۱۶)

انسانی نسل میں عورت کا کردار ماں کی حیثیت سے بے حد بنیادی ہے۔ ماں کی حیثیت گویا نسل انسانی کے لیے شیرازہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب زندگی کے تمام اوراق ماں کے وجود سے جڑتے ہیں۔ ماں کا وجود نہ ہو تو زندگی کے تمام اوراق منتشر ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ ماں کی حیثیت سے عورت کے حقوق کی اسلام میں بے حد تاکید کی گئی ہے۔ ماں کی حیثیت سے عورت کے حقوق کی ادائیگی تمام انسانی اخلاقیات کا سرچشمہ ہے۔ عورت کی یہ حیثیت جس سماج میں محفوظ ہو وہ اعلیٰ انسانی سماج ہوگا۔ اور جس سماج میں عورت کی یہ حیثیت منتشر ہو جائے وہ سماج کبھی اعلیٰ انسانی سماج کی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ دراصل عورت کا کردار ہے جو کسی انسانی سماج کو جنگل کا سماج بنانے سے روکتا ہے۔

۳۰۔ اجتماعی اخلاقیات

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا بُرا ہے۔ اور جو باز نہ آئیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ (الحجرات ۱۱)

ہر عورت اور مرد کے اندر پیدائشی طور پر بڑا بننے کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی کوئی بات مل جائے تو وہ اس کو خوب نمایاں کرتا ہے تاکہ اس طرح اپنے کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا ثابت کرے۔ وہ دوسرے کا مذاق اڑاتا ہے، وہ دوسرے پر عیب لگاتا ہے، وہ دوسرے کو برے نام سے یاد کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی بڑائی کے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔

مگر اچھا اور برا ہونے کا معیار وہ نہیں ہے جو کوئی عورت یا مرد بطور خود مقرر کر لے۔ اچھا دراصل وہ ہے جو خدا کی نظر میں اچھا ہو اور برا وہ ہے جو خدا کی نظر میں بُرا ٹھہرے۔ اگر ہر ایک کے اندر فی الواقع اس کا احساس پیدا ہو جائے تو اس سے بڑائی کا جذبہ چھن جائے گا۔ دوسرے کا مذاق اڑانا، دوسرے کو طعنہ دینا، دوسرے پر عیب لگانا، دوسرے کو بُرے لقب سے یاد کرنا، سب اس کو بے معنیٰ

معلوم ہونے لگیں گے۔ کیوں کہ وہ جانے گا کہ لوگوں کے درجہ ومرتبہ کا اصل فیصلہ خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔ پھر اگر آج میں کسی کو حقیر سمجھوں اور آخرت کی حقیقی دنیا میں وہ باعزت قرار پائے تو میرا اس کو حقیر سمجھنا کس قدر بے معنٰی ہوگا۔

۳۱۔ باعزت قوم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں بانٹ دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے، بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔ (الحجرات ۱۳)

عورت اور مرد کے درمیان مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ کوئی سفید ہے اور کوئی کالا۔ کوئی ایک نسل سے ہے اور کوئی دوسری نسل سے۔ کوئی ایک جغرافیہ سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی دوسرے جغرافیہ سے۔ یہ تمام فرق صرف تعارف کے لیے ہیں، نہ کہ امتیاز کے لیے۔ اکثر خرابیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس قسم کے فرق کی بنا پر ایک دوسرے کے درمیان فرق کرنے لگتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق اور تعصب وجود میں آتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان اپنے آغاز کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کون اللہ سے ڈرنے والا ہے اور کون اللہ سے ڈرنے والا نہیں۔ اور اس کا بھی صحیح علم صرف خدا کو ہے، نہ کہ کسی انسان کو۔

۳۲۔ جنت میں رفاقت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ جنت میں داخلہ کے مستحق قرار پائیں گے اُن کے ساتھ یہ مزید انعام کیا جائے گا کہ اُن کے قریبی رشتہ دار، اگر وہ صالح ہوں تو ان سب کو ایک ساتھ رہنے کا موقع دیا جائے گا تا کہ اُن کی خوشیوں میں اضافہ ہو۔ اس سلسلہ میں قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: اور جو لوگ ایمان لائے اور اُن کی اولاد بھی ان کی راہ پر ایمان کے ساتھ چلی، اُن کے ساتھ ہم ان کی

اولاد کو بھی جمع کر دیں گے، اور اُن کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے۔ ہر آدمی اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے۔ (الطّور ۲۱)

قرآن کی اس آیت میں اہل جنت کے لیے ایک خصوصی انعام کا ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اگر کچھ لوگ اپنے اعمال کے نتیجہ میں جنت کے اونچے درجہ میں جگہ پائیں اور اُن کے قریبی رشتہ دار اُس سے کم درجہ کی جنت کے مستحق ٹھہرے ہوں تو اُن کے ساتھ یہ خصوصی انعام کیا جائے گا کہ نیچے والوں کے درجہ کو اپ گریڈ (upgrade) کر کے اوپر کے درجہ میں پہنچا دیا جائے گا تاکہ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر جنت میں رہ سکیں۔

یہ خدائی قانون ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے اور بیوی دنیا میں زندہ رہے تو بیوی کو غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُس کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام میں زیادہ سے زیادہ خیر کا عمل کرے تاکہ اُس کو موت کے بعد جنت میں زیادہ اعلیٰ درجہ مل سکے۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ خدا اُس کے شوہر کے درجہ کو اَپ گریڈ کر کے شوہر اور بیوی دونوں کو ایک ساتھ رہنے کا موقع عطا فرمائے گا۔

۳۳۔ دونوں کا انعام برابر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: بے شک صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کو قرض دیا، اچھا قرض، وہ اُن کے لیے بڑھایا جائے گا اور اُن کے لیے باعزت اجر ہے۔ (الحدید ۱۸)

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہ گویا کہ اللہ کو قرض دینا ہے۔ یہ قرض آخرت میں بہت بڑے اضافہ کے ساتھ ہر ایک کو لوٹایا جائے گا۔ اس عمل کا تعلق مردوں سے بھی ہے اور عورتوں سے بھی۔ دونوں ہی کے لیے یہ خوش خبری ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں اللہ کے لیے اپنا مال خرچ کریں، اور پھر آخرت میں بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ وہ اُن کو واپس ملے۔

قرض حسن یا خدا کے لیے قرض دینا دراصل اُس انفاق مال کا باعزت نام ہے جو دعوت الی اللہ

کے مقصد کے لیے دیا جائے۔ دعوت کا کام خالص خدائی کام ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی بھی دنیوی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ وہ صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ بندوں کے اوپر خدا کی حجت تمام ہو۔ اسی لیے ایسے مالی انفاق کو قرض حسن کا نام دیا گیا۔

۳۴۔ قریبی دشمن

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، تمہاری بعض بیویاں اور بعض اولاد تمہارے دشمن ہیں، پس تم اُن سے ہوشیار رہو، اور اگر تم معاف کر دو اور درگذر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (التغابن ۱۴)

قریبی رشتہ دار کا معاملہ بے حد نازک معاملہ ہوتا ہے۔ مختلف اسباب سے ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی برائی کو صرف اس لیے کر ڈالتا ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے دباؤ کی وجہ سے وہ کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ کسی رشتہ دار کی طرف سے اس قسم کا رویہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے دشمنی کا رویہ ہے۔ رشتہ داری کو خیر میں تعاون کے لیے کام آنا چاہیے، نہ کہ ایک دوسرے کو برائی کی طرف لے جانے کے لیے۔

۳۵۔ تنگی کے بعد وُسعت

قرآن میں شوہر اور بیوی کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی آمدنی کم ہو اُس کو چاہیے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔ اللہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اُتنا ہی جتنا اس کو دیا ہے، اللہ سختی کے بعد جلد ہی آسانی پیدا کرے گا۔ (الطلاق ۷)

خاندانی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کم آمدنی کی وجہ سے شوہر اور بیوی کے درمیان جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ گھر کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ معاملہ کو صرف حال (present) کے اعتبار سے دیکھتے ہیں، وہ معاملہ کو مستقبل (future) کے اعتبار سے نہیں دیکھ پاتے۔ یہی ذہن تمام جھگڑے کی جڑ ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ حال سے اوپر اُٹھ کر سوچیں۔

وہ مستقبل کے امکانات پر اعتماد کریں۔ یہ طریقِ فکر عورت اور مرد کے درمیان حوصلہ پیدا کرنے والا ہے۔ وہ مسئلہ کو وقتی مسئلہ قرار دے کر اُس کی سنگینی کو ختم کر دیتا ہے۔

۳۶۔ دینی تربیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے، اس پر تندخو اور زبردست فرشتے مقرر ہیں، اللہ ان کو جو حکم دے اس میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا اُن کو حکم ملتا ہے۔ (التحریم ٦)

عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ مادی نقصان اور فائدہ کے اعتبار سے سوچتے ہیں۔ وہ اپنے قریبی مسائل میں اُلجھے رہتے ہیں۔ یہ ذہن ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں آخرت کے نقصان اور فائدہ کے اعتبار سے سوچیں۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خاندان کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی فکر کریں۔ ہر ایک کو سب سے زیادہ شوق اخروی جنت کا ہو، نہ کہ دنیوی فائدہ کے حصول کا۔

۳۷۔ انجام کا مدار عمل پر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اللہ منکروں کے لیے مثال بیان کرتا ہے نوح کی بیوی کی اور لوط کی بیوی کی، دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں۔ پھر اُنھوں نے اُن کے ساتھ خیانت کی تو وہ دونوں اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ کام نہ آسکے اور دونوں کو کہہ دیا گیا کہ آگ میں داخل ہو جاؤ داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ ایمان والوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے فرعون کی بیوی کی، جب کہ اُس نے کہا کہ اے میرے رب، میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھ کو فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے۔ (التحریم، ١٠۔١١)

قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کو جو مقام ملے گا وہ ذاتی عمل کی بنیاد پر ملے گا، نہ کہ رشتہ داری کی بنیاد پر۔ کوئی مرد یا عورت کس نسل سے ہے یا رشتہ کے اعتبار سے

اُس کا تعلق کس سے ہے، یہ صرف دنیوی تعلق کی بات ہے۔ آخرت میں خدا کے انعام اور سزا کا تعین ان تعلقات کی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کسی مرد یا عورت نے خود کیا کیا۔

۳۸۔ احوال قیامت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے، اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر لگا ہوگا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے۔ اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی، ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں۔ (عبس ۳۴۔۴۲)

قرآن کی ان آیتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موت کے بعد قیامت کا جو دن آنے والا ہے وہ کتنا زیادہ ہولناک ہوگا۔ اُس دن دنیا کی محبتیں اور دنیا کی دشمنیاں سب ختم ہو جائیں گی۔ ہر ایک کو صرف اپنی فکر ہوگی۔ ہر مرد اور عورت کا یہ حال ہوگا کہ وہ سارے دنیوی تعلقات کو بھول کر صرف خدا کی طرف دیکھ رہا ہوگا۔ وہ صرف ایک خدا سے رحمت کا امیدوار بن جائے گا۔

ہر مرد اور عورت کو چاہیے کہ وہ زندگی کی اس نوعیت کو سمجھے۔ جب کوئی ناموافق صورت حال اُس کے سامنے آئے تو وہ اس کا سامنا اس احساس کے ساتھ کرے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا مجھ کو ان حالات میں ڈال کر میرا امتحان لینا چاہتا ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جو کسی عورت یا مرد کو موجودہ دنیا میں اعتدال پر قائم رکھ سکتی ہے۔ یہی سوچ اس بات کی ضامن ہے کہ اُس کی سوچ صحیح سوچ ہو اور اُس کا عمل صحیح عمل۔

۳۹۔ نفس مطمئنہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ جنتی مردوں اور جنتی عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے گا: اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف۔ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنت میں۔ (الفجر ۲۷۔۳۰)

اس آیت میں نفس مطمئن ایک عام لفظ ہے۔ اس سے مرد اور عورت دونوں مراد ہیں۔ نفس مطمئن کا مطلب ہے، مطمئن روح یا نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک روح (complex-free soul)۔

جنت میں داخلہ کے مستحق صرف وہ عورت اور مرد قرار پائیں گے جو دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں کہ ہر حال میں وہ اعتدال پر قائم رہیں۔ وہ خوشحالی میں مغرور نہ بنیں اور مفلسی میں مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ وہ اقتدار کی حالت میں بھی تواضع کے اصول پر قائم رہیں اور بے اقتدار کی حالت میں بھی۔ انہیں فائدہ ہو یا نقصان، انہیں عزت ملے یا بے عزتی، وہ کامیاب ہوں یا ناکام، ہر حال میں وہ یکساں طور پر خدا کے پرستار بنے رہیں۔ زندگی کا کوئی اتار اور چڑھاؤ انہیں سچائی اور انصاف کے راستہ سے ہٹانے والا نہ ہو۔

ایسے ہی عورت اور مرد خدا کی نظر میں نفس مطمئن ہیں اور جو مرد اور عورت اس معیار پر پورے اتریں وہی خدا کے مطلوب بندے قرار پائیں گے۔

۴۰۔ پُر مشقت زندگی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ اور تم اس میں مقیم ہو۔ اور قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی۔ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ (البلد ۱۔۴)

قرآن کی اس آیت میں خدا کے تخلیقی نقشہ کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ دنیا کو خدا نے آرام گاہ کے طور پر نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو امتحان گاہ کے طور پر بنایا ہے۔ اس امتحانی مصلحت کی بنا پر دنیا میں ہر مرد اور عورت کے ساتھ طرح طرح کی مصیبتیں اور مشقتیں پیش آتی ہیں۔ کیوں کہ مصیبتوں اور مشقتوں میں ڈالے بغیر امتحان کا عمل انجام نہیں پا سکتا۔

عورت حدیث میں

حدیث کی کتابوں میں کتاب النساء جیسا کوئی چیپٹر نہیں ہوتا۔ تاہم مختلف موضوعات کے تحت عورتوں کے بارہ میں کثرت سے ایسی روایتیں آئی ہیں جو عورتوں کے متعلق اسلام کی تعلیم کو بتاتی ہیں۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا درجہ انسانی سماج میں کیا ہے۔ یہاں حدیث کی مختلف کتابوں سے اس قسم کی کچھ روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ یہ روایتیں بتاتی ہیں کہ اسلام کے نقشۂ حیات میں عورت کا مقام کیا ہے۔

۱۔ عورت نصف انسانیت

پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہ صدیقہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا ایک سوال کیا گیا تھا۔ اس مسئلہ کا جواب دیتے ہوئے آپ نے مزید فرمایا: عورتیں بلاشبہہ مرد کا شقیقہ ہیں (**انما النساء شقائق الرجال**) **ابوداؤد، کتاب الطهارة، الترمذی، کتاب الطهارة، مسند احمد ۲۵۶/۶**۔

شقیق یا شقیقہ عربی زبان میں، کسی چیز کے درمیان سے پھٹے ہوئے دو برابر برابر حصے کو کہتے ہیں۔ اسی سے درد شقیقہ بولا جاتا ہے۔ یعنی وہ درد جو سر کے آدھے حصہ میں ہو۔ اوپر کی روایت میں اسی مفہوم میں عورت کو مرد کا شقیقہ کہا گیا ہے۔ یہ عورت کی حیثیت کی نہایت صحیح تعبیر ہے۔ اسلام کے مطابق، عورت اور مرد دونوں ایک کُل کے دو برابر برابر اجزاء ہیں۔ اس کُل کا آدھا عورت ہے اور اُس کا آدھا مرد۔ اس اعتبار سے یہ بات عین درست ہوگی کہ عورت کو نصفِ انسانیت کا لقب دیا جائے۔

۲۔ اخلاق کا معیار

عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے اچھا ہوں۔ اور جب تمہارا ساتھی انتقال کر جائے تو تم اُس کے لیے دعا کرو (**خیر کم خیر کم لأهله و أنا خیر کم**

لأهلی و اذا مات صاحبکم فادعوہ)الترمذی، الدارمی، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۷۱ (رقم الحدیث ۳۲۵۲)

گھر کی زندگی میں شوہر اور بیوی مستقل طور پر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بار بار ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ غصہ اور نفرت کے جذبات جاگتے ہیں۔ ایسی حالت میں حُسن اخلاق کا سب سے بڑا آزمائشی مقام اُس کا اپنا گھر ہے۔ جو مرد اپنے گھر کے اندر بہتر سلوک کا ثبوت دے وہ اخلاقی امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح جو عورت اپنے گھر کے اندر حُسن سلوک پر قائم رہے اُس نے آزمائش میں کامیابی حاصل کی۔ ایسے عورت یا مرد باہر کی زندگی میں بھی کامیاب رہیں گے۔

گھر کی زندگی میں جب ایک ساتھی کو موت آجائے اور دوسرا ساتھی زندہ رہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زندہ کے دل میں وفات یافتہ کے بارہ میں غم اور ماتم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ایسے حادثہ کے موقع پر اپنے جذبات کا رُخ دعا کی طرف کر دیا جائے۔ جو کچھ دنیا میں کھویا گیا ہے اُس کو آخرت میں پانے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ شرافت کی پہچان

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کی عزت وہی شخص کرے گا جو شریف ہو اور عورتوں کو وہی شخص بے عزت کرے گا جو کمینہ ہو (**ماا کرم النساء الا کریم و ما اھانھن الا لئیم**) الحدیث

عزت اور مرتبہ کے لحاظ سے عورت اور مرد دونوں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر زندگی کے نظام میں دونوں کے درمیان تقسیمِ کار کا اُصول رکھا گیا ہے۔ مرد پر نسبتاً سخت کام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور عورت کو مقابلۃً نرم کام کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس تقسیمِ کار کی بنا پر عورت اور مرد کی جسمانی بناوٹ میں فرق رکھا گیا ہے۔ مرد جسمانی اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور عورت جسمانی اعتبار سے نسبتاً غیر قوی ہے۔ اس فرق کی بنا پر مرد کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ عورت کو اپنی چیرہ دستی کا شکار بنا سکے۔ مگر خدا کے

نزدیک یہ مرد کے لیے ایک امتحان کا پرچہ ہے۔ مرد کو چاہیے کہ وہ جسمانی اعتبار سے قوی ہونے کے باوجود عورت کا پورا احترام کرے۔ خدا کی شریعت کا اُصول یہ ہے کہ شریف انسان وہ ہے جو کمزور کے مقابلہ میں شریف ثابت ہو۔ وہ انسان ایک کمینہ انسان ہے جو کسی کو کمزور پا کر اُس کو اپنی زیادتی کا نشانہ بنانے لگے۔

۴۔ ہر حال میں خیر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی خصلت اس کو ناپسند ہوگی تو کوئی دوسری خصلت اس کی پسند کے مطابق ہوگی۔ (لایفرك مومن مومنة۔ ان کرہ منها خلقاً رضی منها آخر)۔صحیح مسلم، کتاب الرضاع

فطرت کی تقسیم کا عام اُصول یہ ہے کہ کسی ایک عورت یا کسی ایک مرد کو ساری خوبیاں نہیں دی جاتیں۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کو ایک خوبی زیادہ ملتی ہے تو دوسری خوبی میں اُس کے ساتھ کمی کر دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک عورت کو اگر ظاہری جسمانی خصوصیات میں زیادہ حصہ ملا ہو تو داخلی خصوصیات میں وہ اُسی نسبت سے کم ہوگی۔ اسی طرح اگر ایک عورت داخلی سیرت میں زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو ظاہری صفات کے اعتبار سے وہ نسبتاً کم ہوگی۔ یہ فطرت کا ایک عام اُصول ہے جس میں بہت کم استثناء پایا جاتا ہے۔

مذکورہ حدیثِ رسول میں اسی فطری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کسی مرد کی بیوی اگر ایسی ہو جو ظاہری صورت کے اعتبار سے زیادہ پُرکشش نہ ہو تو اُس کو بد دل ہونے کی ضرورت نہیں۔ فطرت کے قانون پر اعتماد کرتے ہوئے اُس کے اندر یہ یقین ہونا چاہیے کہ اُس کی بیوی سیرت کے اعتبار سے یقینی طور پر زیادہ بہتر ہوگی۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ حقیقی زندگی میں صورت کے مقابلہ میں سیرت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

۵۔ بہتر اخلاق کی پہچان

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومنین میں سب سے کامل ایمان

والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے۔ اور تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے اچھا ہو۔ (**اکمل المؤمنین ایماناً احسنھم خلقاً و خیارکم خیارکم لنسائھم**)۔

الترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۷۳ (رقم الحدیث ۳۲۶۴)

یہ حدیث بظاہر مرد کے لیے ہے۔ مگر اپنے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے وہ مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت جب شادی شدہ زندگی اختیار کر کے ایک ساتھ رہتے ہیں تو بار بار دونوں کے درمیان اختلاف اور شکایت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں غصہ اور نفرت اور انتقام کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہ موقع دونوں کے لیے امتحان کا موقع ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر دونوں صبر اور تحمل کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ بہتر مرد اور زیادہ بہتر عورت ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ صحیح اسلامی رویہ اختیار کر کے خدا کے یہاں اپنا درجہ بلند کر سکتے ہیں۔

۶۔ بہتر خاتون کون

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ عورتوں میں سب سے بہتر عورت کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ عورت کہ مرد جب اُسے دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے۔ اور مرد جب کسی کام کے لیے کہے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور اپنے نفس اور اپنے مال میں وہ مرد کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرے (**عن ابی ھریرۃ قال: سئل رسول اللہ ﷺ ای النساء خیر قال: الذی تسرہ اذا نظر وتطیعہ اذا أمر و لا تخالفہ فیما یکرہ فی نفسھا ومالہ**)۔

مسند احمد، جلد ۲، صفحہ ۲۵۱

یہ حدیث اپنے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں کے لیے ہے۔ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے زندگی کے ساتھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں ایک دوسرے کے رازداں ہیں۔ زندگی کا کاروبار چلانے کے لیے وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ایک گاڑی کے دو پہیئے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایسی حالت میں انسانیت کا تقاضا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سچے رفیق ثابت

ہوں۔ وہ ایک دوسرے کوخوش رکھنے کا اہتمام کریں۔ وہ ایک دوسرے کی رعایت کرنے والے ہوں۔ وہ غیر موجودگی میں بھی ایک دوسرے کے خیر خواہ بنے رہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے وہ کریں جو رفیقِ حیات کی حیثیت سے اُصولی طور پر اُنہیں ایک دوسرے کے لیے کرنا چاہیے۔

۷۔ عورت سرمایۂ حیات

عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی ہر چیز سامان ہے۔ اور دنیا کا سب سے اچھا سامان نیک عورت ہے (**عن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : الدنيا كلها متاع، وخير متاع الدنيا المرأة الصالحة**)

صحیح مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۲۷ (رقم الحدیث ۳۰۸۳)

عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے زندہ متاع یا زندہ سرمایۂ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گذارنے کے لیے عورت اور مرد دونوں کو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ شوہر اور بیوی کی صورت میں دونوں کو جو سرمایہ ملتا ہے وہ دوسری تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

یہ حقیقت اگر دونوں کے دل میں بیٹھ جائے تو عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرنے والے بن جائیں گے۔ دونوں یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ وہ ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کا تحمل نہیں کر سکتے۔ دونوں کا یہ خیال ہو جائے گا کہ انہوں نے اگر ایک دوسرے کی قدر نہ کی تو خود ان کی اپنی زندگی ہی بے معنٰی ہو کر رہ جائے گی۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح اپنی ضرورت سمجھیں گے جس کی تلافی کسی اور صورت میں ممکن نہیں۔

۸۔ سب سے بہتر خزانہ

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ آدمی کے لیے بہتر جمع کرنے والا مال کیا ہے۔ نیک عورت کہ جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے۔ اور جب وہ اس کو حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔ اور جب وہ موجود نہ ہو تو وہ اس

کی حفاظت کرے (عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ألا اخبرك بخير ما يكنز المرأ. المرأة الصالحة اذا نظر اليها سرته و اذا امرها اطاعته و اذا غاب عنها حفظته)۔سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ

اس حدیث میں عورت کی جو صفات بتائی گئی ہیں وہ کوئی سادہ صفات نہیں ہیں۔اس حدیث کو پوری طرح اُس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ اُس کو اُس کے ظاہری الفاظ سے اوپر اُٹھ کر دیکھا جائے۔جب کہ اُس کو زندگی کے زیادہ گہرے پہلوؤں کے ساتھ جوڑ کر سمجھا جائے۔

مرد کے لیے عورت صرف اس کی گھریلو ساتھی نہیں ہے بلکہ وہ اُس کے لیے سب سے بڑے خزانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کوئی ہو جو سوچنے کے عمل میں اُس کے ساتھ شیئر (share) کر سکے۔جو پورے معنوں میں اس کا فکری رفیق (intellectual partner) بن جائے۔عورت کسی مرد کی اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔وہ اُس کی ایک قابل اعتماد ذہنی رفیق ہے۔کسی مرد کی بیوی ہی اس کی وہ ساتھی ہے جو اُس کو ہر صبح وشام حاصل رہتی ہے۔

مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی رفیقۂ حیات کو اس اعتبار سے تیار کرے۔تعلیم وتربیت کے ذریعہ وہ عورت کو اس قابل بنائے کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنے شوہر کی ذہنی رفیق (intellectual partner) بن سکے۔اس قسم کی ذہنی رفاقت کے جو فائدے ہیں اُنہی میں سے کچھ فائدوں کا ذکر علامتی طور پر مذکورہ حدیث میں کیا گیا ہے۔

۹۔ زندگی کی مددگار

ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قرآن میں جب یہ آیت اُتری کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اُن کے لیے وعید ہے تو بعض صحابہ نے کہا کہ اگر ہم یہ جانتے کہ کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسی کو لیتے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل چیز خدا کی یاد کرنے والی زبان ہے۔اور خدا کا شکر کرنے والا دل ہے۔اور مومن بیوی ہے جو اس کے ایمان پر اُس کی مدد کرے (عن ثوبان قال

لما نزلت (والذین یکنزون الذهب والفضة) کنا مع النبی ﷺ فی بعض اسفاره فقال بعض اصحابه نزلت فی الذهب والفضة لو علمنا ای المال خیر فنتخذه۔ فقال افضله لسان ذاکر وقلب شاکر و زوجة مؤمنة تعینه علی ایمانه۔

احمد، الترمذی، ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۶۰۴ (رقم الحدیث ۲۲۷۷)

مادی دولت صرف دنیا کی عارضی زندگی میں کچھ راحت دے سکتی ہے۔ مگر ذکر اور شکر اور ایمان کی دولت وہ دولت ہے جو آخرت کی ابدی زندگی میں زیادہ بڑی راحت کا ذریعہ بنے گی۔ ذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا کو یاد کرے، اس کا ذہن خدا کی سوچ میں لگا رہے۔ شکر یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی نعمتوں کا گہرا احساس ہو جائے۔ وہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ خدا کے انعامات کا اعتراف کرنے لگے۔ ایمان سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی شعوری دریافت کے نتیجہ میں آدمی کے اندر جو عقیدہ بنتا ہے اُسی کا نام ایمان ہے۔

کسی مرد کے لیے عورت ان پہلوؤں سے سب سے بڑی مددگار ہے۔ مرد اور عورت اپنی روزانہ کی زندگی میں جب ایک دوسرے سے فکری تبادلہ (intellectual exchange) کرتے ہیں تو دونوں کو اس سے یہ فائدہ ملتا ہے کہ وہ خدا کی یاد کا گہرا روحانی تجربہ کرتے ہیں۔ وہ خدا کے عطیات کا تذکرہ کر کے ایک دوسرے کے اندر شکر کے جذبات کو بڑھاتے ہیں۔ وہ خدا کی ذات وصفات میں باہمی غور وفکر کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں دونوں کی معرفت (realization) میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ قابل اعتماد ساتھی

ابوامامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے تقویٰ کے بعد سب سے بہتر چیز جو ایک مومن پاتا ہے وہ نیک بیوی ہے۔ اگر وہ اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔ اور اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر وہ اس پر قسم کھا لے تو وہ اس کو پورا کرے اور اگر وہ اس سے غائب ہو تو وہ اپنے نفس اور اُس کے مال میں اس کی خیر خواہی کرے **(عن ابی امامة عن النبی ﷺ انه یقول: ما استفاد المؤمن بعد تقوی الله**

خیراً لہ من زوجۃ صالحۃ ان امرھا اطاعتہ و ان نظر الیھا سرّتہ و ان أقسم علیھا ابرّتہ و ان غاب عنھا نصحتہ فی نفسھا و مالہ)۔

ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۳۰ (رقم الحدیث ۳۰۹۵)

یہ بات اپنے وسیع تر مفہوم میں عورت اور مرد دونوں کے اوپر منطبق ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین جوڑا اُسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ دونوں اپنے اندر مذکورہ صفات پیدا کرلیں۔

مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے تکملہ (complement) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنے وجود کو مکمل کرتا ہے۔ عورت کے بغیر مرد کی زندگی نامکمل ہے اور اسی طرح مرد کے بغیر عورت کی زندگی نامکمل ہے۔

عورت اور مرد دونوں اپنی زندگی کا یہ فریضہ صرف اس طرح ادا نہیں کرسکتے کہ وہ نکاح کرکے ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوجائیں۔ اسی کے ساتھ اُنہیں ایک اور کام کرنا ہے۔ مذکورہ اعتبار سے وہ اپنے شعور کو بیدار کریں۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے دونوں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کریں۔ دونوں کے لیے اُن کا گھر ایسا مدرسہ بن جائے جس میں شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے ٹیچر بھی ہوں اور اسی کے ساتھ ایک دوسرے کے اسٹوڈنٹ بھی۔ اس دوسرے پہلو سے دونوں کے درمیان رشتہ کی مضبوطی ان کی ازدواجی زندگی کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

حدیث کے یہ الفاظ بے حد اہم ہیں کہ وہ اس کے مال میں خیرخواہی کرے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہترین عورت وہ ہے جو گھر کی آمدنی کو صحیح طور پر خرچ کرے۔ وہ انتظام مال (money management) میں پوری طرح اپنے شوہر کی مددگار رہو۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مال دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے قیام کا ذریعہ ہے (النساء ۵) مال کا بہترین استعمال یہ ہے کہ اس کو حقیقی ضرورت کی مد میں خرچ کیا جائے۔ مال کے معاملہ میں فضول خرچی کرنا اتنا برا کام ہے کہ جو مرد اور عورت ایسا کریں ان کو قرآن میں شیطان کا بھائی اور بہن بتایا گیا ہے (الاسراء ۲۷)

مال کے معاملہ میں فضول خرچی کا تعلق عورتوں سے بہت زیادہ ہے۔قرآن کے مطابق،عورتیں اپنے مزاج کے اعتبار سے تزئین اور نمائش جیسی چیزوں کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں (الزخرف ۱۸) اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھروں میں تقریبات اور فرنیچر اور کپڑے اور دوسری مدوں میں مال کا جو غیر ضروری خرچ ہوتا ہے وہ زیادہ تر عورتوں کے نمائشی ذوق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مال کا صحیح خرچ اور اس کا غلط خرچ دونوں کا انحصار زیادہ تر عورت کے اوپر ہے۔

اس بات کو مثبت انداز میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کسی گھر کی کامیابی کا راز سادگی کلچر میں ہے، اور سادگی کلچر کا معاملہ تمام تر عورت کے اوپر منحصر ہوتا ہے۔سادگی بظاہر ایک معمولی چیز ہے مگر عملی اعتبار سے دیکھیے تو وہ زندگی کی اہم ترین قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں سادگی ہوگی وہاں ہر دوسری چیز اپنے آپ موجود ہوگی۔کسی نے بہتر زندگی کا فارمولا درست طور پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے— سادہ زندگی اور اونچی سوچ:

Simple living, high thinking

سادگی اور اونچی سوچ دونوں ایک دوسرے سے لازمی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں سادگی ہوگی وہاں اونچی سوچ ہوگی۔ اور جہاں اونچی سوچ ہوگی وہاں سادگی بھی ضرور پائی جائے گی۔سادگی کا مطلب ہے، حقیقی ضرورت اور غیر حقیقی ضرورت میں فرق کرنا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ غیر حقیقی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ لینا اور اسی کے لیے مال خرچ کرنا ایک ایسی بری عادت ہے جو آدمی کے اندر ذہنی ارتقاء (intellectual development) کے عمل کو روک دیتی ہے۔اس کے برعکس غیر حقیقی ضرورت کو نظر انداز کرنا اور صرف حقیقی ضرورت پر اپنا مال خرچ کرنا آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ ذہنی ترقی کے عمل میں مصروف ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فضول خرچی اور اعلیٰ انسانیت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔ اعلیٰ انسانیت کے لیے سادہ زندگی ضروری ہے۔

کسی گھر کو سادگی کے اصول پر چلانا صرف عورت کا کام ہے۔عورت اگر صرف یہی ایک کام

کرے کہ مال کے حسن انتظام کے ذریعہ وہ گھر کے اندر سادگی کلچر کورائج کردے تو یہ اتنا بڑا کام ہوگا کہ اسی ایک کارنامہ کی بنا پراس کو معمار انسانیت کا لقب دیا جاسکتا ہے۔

سادگی بااصول زندگی کی علامت ہے۔ اسی طرح انتظام مال(money management) منصوبہ بند زندگی کی علامت۔ جولوگ ایسا کریں وہ گویا زندگی میں ترجیحات(priorities) کو جانتے ہیں۔ انہوں نے بے مقصد زندگی کا طریقہ چھوڑ کر بامقصد زندگی کے طریقہ کو اختیار کیا۔ انہوں نے حیوانی سطح کی زندگی سے اوپر اٹھ کر انسانی سطح کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دنیا میں بھی خدا کا انعام ملتا ہے اور آخرت میں بھی وہ خدا کے انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ حسنات دنیا کے بھی حصہ دار ہیں اور حسنات آخرت کے بھی حصہ دار۔

۱۱۔ زندگی کی عظیم نعمت

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں ہیں جن کو وہ دی گئیں تو اس کو دنیا اور آخرت کی تمام بھلائی دے دی گئی۔ شکر کرنے والا دل اور ذکر کرنے والی زبان اور مصیبتوں پر صبر کرنے والا بدن اور ایسی بیوی جس کے نفس اور اپنے مال میں اس کو کوئی ڈر نہ ہو(**عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال: اربع من أعطيهن فقد اعطى خير الدنيا والآخرة قلب شاكر ولسان ذاكر و بدن على البلاء صابر و زوجة لا تبغيه خوفا فى نفسها ولا ماله**)

البیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹۷۶ (رقم الحدیث ۳۲۷۳)

ایسی بیوی جس کے نفس اور اپنے مال میں اس کو کوئی ڈر نہ ہو — اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بیوی جس کے اوپر آدمی کو پورا اعتماد ہو۔ یہ اعتماد ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ جب شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کو آخری حد تک اپنا سمجھ لیں تو اُس وقت دونوں کے درمیان غیریت کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ جیسے کہ دونوں کے درمیان ''میں اور وہ'' کا فرق مٹ گیا ہو۔ دونوں کی شخصیت ایک دوسرے میں ضم ہوکر ایک زندہ کُل بن گئی ہو۔

عورت اور بیوی کے درمیان اپناپن کا یہی ماحول دونوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ جب دونوں کے درمیان اس طرح کا تعلق قائم ہو جائے تو دونوں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا میں وہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ گویا پوری انسانیت اُن کے ساتھ ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میرے باہر کا پورا عالم میرے ساتھ زندگی کے سفر میں شریک ہو گیا ہے۔ یہ احساس دونوں کے اندر اتنا زیادہ حوصلہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے بعد انہیں کوئی بھی چیز ناممکن نظر نہیں آتی۔

عورت کسی مرد کے لیے سب کچھ اُس وقت بنتی ہے جب کہ وہ محسوس کرے کہ مرد بھی اُس کے لیے اُس کا سب کچھ بن گیا ہے۔ باہمی اعتماد کا یہ معاملہ بلاشبہہ دوطرفہ ہے۔ فطری قوانین کے تحت یہ معاملہ یک طرفہ طور پر قائم نہیں ہوسکتا۔

۱۲۔ رعایت کا معاملہ

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کیوں کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھ اس کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو تو تم اس کو توڑ دو گے اور اگر تم اس کو چھوڑ دو تو وہ ویسی ہی رہے گی۔ پس تم عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو **(عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: استوصوا بالنساء خيراً فان المرأة خلقت من ضلع وانَّ اعوج شئ فى الضلع اعلاه فان ذهبت تقيمه كسرته وان تركته لم يزل اعوج فاستوصوا بالنساء)۔**

صحیح البخاری، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۲، صفحہ ۹٦۷ (رقم الحدیث ۳۲۳۸)

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ خاتونِ اول حوّا کے طریقِ تخلیق کے بارہ میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ عورت کے عام مزاج کو بتاتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، پسلی کی ہڈی کسی قدر ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اس کا ٹیڑھا ہونا اس کا نقص نہیں ہے بلکہ یہی اس کی موزونیت ہے۔ پسلی کی ہڈی کو اگر آپریشن کرکے سیدھا کر دیا جائے تو وہ جسم انسانی میں اپنی کارکردگی کو صحیح طور پر ادا نہ کرسکے گی۔

ایک اورروایت میں یہ لفظ ہے کہ المرأۃ کا لضلع (عورت پسلی کی ہڈّی کی مانند ہے)۔ یہ تمثیل کی زبان ہے۔اور یہ تمثیل دراصل عورت کی ایک صفت کو بتانے کے لیے ہے۔اور وہ یہ کہ عورت نسبتاً جذباتی(emotional) ہوتی ہے۔مرد کے مقابلہ میں عورت کوکسی قدر جذباتی اس لیے بنایا گیا ہے کہ چیزوں سے اس کوایک جذباتی تعلق ہوجائے اوراس بنا پر وہ اپنی مخصوص ذمہ داریوں کو بہتر طور پر ادا کر سکے۔اسی مخصوص مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ عورت کو اپنے بچّہ کے ساتھ انتہائی جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ اگر یہ جذباتی تعلق نہ ہوتو عورت اپنے بچہ کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کوادا نہ کر سکے۔

۱۳۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے خوشبواورعورتیں محبوب بنائی گئی ہیں اورمیری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے(**حبب الی من دنیاکم الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ**)

احمد، النسائی، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۳، صفحہ ۱۴۴۸ (رقم الحدیث ۵۲۶۱)

اس حدیث میں ضمیر متکلم کے اسلوب میں دراصل انسانی فطرت کو بتایا گیا ہے۔انسان کے اندرفطری طور پر یہ مزاج ہے کہ وہ اپنے زوج (جوڑے) کی طرف خصوصی میلان رکھتا ہے۔وہ اپنے جوڑے کواپنا تکمیلی حصہ سمجھتا ہے۔اس کا پوراوجود محسوس کرتا ہے کہ اس جوڑے کے بغیر اُس کی ہستی مکمل نہیں۔یہ فطرت کی تخلیق کاایک حصہ ہے۔اس کا تعلق ہرانسان سے ہے۔

مرداورعورت دونوں کومل کر دنیا میں جو کام کرنا ہے وہ بے حد صبر آزما کام ہے۔وہ ایک پُرمشقت جدوجہد ہے۔اس پُرمشقت جدوجہد کو خوشگوار بنانے کے لیے عورت اور مرد کے اندر ایک دوسرے کے لیے محبت رکھ دی گئی ہے۔یہی الفت اورمحبت کسی انسانی سماج کو مستحکم سماج بناتی ہے۔اجتماعی زندگی میں الفت اورمحبت کی حقیقت چپکانے والے مادہ(adhesive) کی ہے۔اگر یہ الفت اورمحبت ختم ہوجائے تو خاندان اورسماج دونوں انتشار کا شکار ہوکر رہ جائیں۔کامل قربت (total communion) صرف شوہراور بیوی کے درمیان قائم ہوتا ہے۔

۱۴۔ سب سے افضل متاع

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں (اتقوا اللہ فی النساء لیس من متاعِ الدنیا شئ افضل من المرأة الصالحة)۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح

مرد اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک ادھوری شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ عورت کے ساتھ مل کر اُس کی شخصیت مکمل ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خود عورت کا بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر عورت اور ہر مرد خود اپنے تجربہ کے ذریعہ سمجھ سکتا ہے۔

اس اعتبار سے عورت اور مرد کی باہمی رفاقت زندگی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ مگر اس رفاقت کو نباہنے کے لیے کوئی مجبورانہ بندھن موجود نہیں۔ یہی وہ پہلو ہے جو دونوں کے درمیان باہمی رفاقت کو نباہنے کے لیے خدا کے خوف کو ضروری بنا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس رفاقت کی کامیابی کے لیے ضرورت ہے کہ دونوں کے اندر اُس کی اُصولی اہمیت کا شعور زندہ ہو۔ خدا کا خوف اسی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اور پھر یہ شعور اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ غیر موافق اسباب کے باوجود دونوں کے درمیان رفاقت کا تعلق کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔

۱۵۔ عورت ماں کی حیثیت سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جان لو، جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ (اعلموا أن الجنة تحت اقدام الامهات) الحدیث

عورت ماں کی حیثیت سے اپنی اولاد کی سب سے بڑی محسن ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے انسان کے اوپر ماں کا درجہ سب سے زیادہ ہے۔ اس حدیث میں دراصل اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ محسن کے احسان کا اعتراف سب سے بڑی نیکی (virtue) ہے۔ اس نیکی کی اسپرٹ جس کے اندر ہو اُس کے اندر بیک وقت دو صفتیں موجود ہوں گی — انسان کی نسبت سے اُس کے حسنِ سلوک کا گہرا اعتراف

اور خدا کی نسبت سے اُس کے احسان کا گہرا شکر۔ یہی صفت کسی انسان کے لیے جنت میں داخلہ کا سب سے بڑا استحقاق ہے۔

۱۶۔ لڑکیوں کی تربیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے تین لڑکیوں کی پرورش کی۔ پھر اس نے ان کو ادب سکھایا اور اُن کی شادی کی اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے (**من عال ثلاث بنات فادبھن و زوجھن واحسن الیھن فلہ الجنۃ**) سنن ابی داؤد، کتاب الادب۔

عام مزاج یہ ہے کہ اگر کسی باپ کے یہاں کئی لڑکیاں ہوں اور کوئی لڑکا نہ ہو تو وہ لڑکیوں کو بے قدر کر دیتا ہے۔ اس حدیث میں اسی ذہن کی تردید کی گئی ہے۔ کسی باپ کے یہاں لڑکا پیدا ہو یا لڑکی، دونوں حالتوں میں باپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دے۔ وہ اُن کو ایسی تربیت دے جو اُن کے لیے زندگی گذارنے میں مددگار بنے۔

باپ کا رجحان اکثر اپنی اولاد کے لیے یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن کے لیے زندگی کی راحتیں فراہم کرے۔ وہ کما کر اُنہیں زیادہ سے زیادہ مال دے سکے۔ مگر یہ نظریہ درست نہیں۔ اولاد کے لیے باپ کا سب سے بہتر عطیہ مال نہیں ہے بلکہ تعلیم ہے۔ باپ کا کمایا ہوا مال اولاد کے لیے بلا محنت کی کمائی (easy money) کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا مال اکثر آدمی کو خراب کر دیتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آدمی اپنی اولاد کو تعلیم دے۔ اور اس طرح اُنہیں اس قابل بنائے کہ وہ محنت کر کے خود اپنی بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

۱۷۔ لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے یہاں لڑکی ہو۔ پھر وہ نہ اُس کو زمین میں گاڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے اور نہ اُس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اُس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (**من کانت لہ انثی فلم یئدھا ولم یھنھا و لم یؤثر ولدہ علیھا (یعنی الذکور) ادخلہ اللہ الجنۃ**)۔ سنن ابی داود، کتاب الأدب

حسن سلوک ایک ایسی نیکی ہے جو ہر مرد اور عورت کے ساتھ مطلوب ہے۔ مگر لڑکیوں کے

سلسلہ میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ غریب طبقہ کے لوگ لڑکیوں کو اپنے اوپر بوجھ سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اُن کے معاملہ میں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی طور پر ادا نہیں کر پاتے۔ دولت مند طبقہ اپنے مخصوص لائف اسٹائل کی بنا پر خود اپنے لیے زندگی کی خوشیوں کو تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اس آزادی کے نتیجہ میں لڑکیاں اپنی ابتدائی عمر ہی میں تباہ کن غلطیوں کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ایسی حالت میں لڑکیاں اپنے سرپرستوں کے لیے نازک ذمہ داری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنا اسلام کی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر کوئی شخص اپنے رب کے یہاں بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔

۱۸۔ بے سہارا لڑکیوں کی خدمت

سراقہ بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ افضل صدقہ کیا ہے۔ تمہاری لڑکی جو (بیوگی یا طلاق کی وجہ سے) تمہاری طرف لوٹا دی جائے۔ تمہارے سوا کوئی اس کے لیے کمانے والا نہ ہو (**عن سراقة بن مالك ان النبی ﷺ قال: الا ادلكم على افضل الصدقة ابنتك مردودة اليك ليس لها كاسب غيرك**)

سنن ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۳، صفحہ ۱۳۹۳ (رقم الحدیث ۵۰۰۲)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت طلاق کی وجہ سے یا بیوہ ہو جانے کی وجہ سے اپنے سسرال میں رہ نہیں سکتی اور وہاں سے واپس ہو کر وہ اپنے باپ کے پاس آجاتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسی عورت سماج میں بے سہارا بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا بے سہارا ہونا اس کے والدین کے لیے اخلاقی خدمت کا ایک اعلیٰ موقع عطا کرتا ہے۔ اگر اس کے والدین ایسی خاتون کو دوبارہ قبول کرلیں، اُس کے لیے نئ زندگی کے مواقع تلاش کریں، اُس کو پھر سے سماج کا ایک باعزت ممبر بنانے کی کوشش کریں، اُس کو ازسرِ نو ایک کامیاب زندگی گذارنے کے قابل بنائیں تو اُن کا یہ عمل خدا کے یہاں ایک عظیم عمل شمار کیا جائے گا اور وہ اپنے اس عمل کی بنا پر آخرت کی دنیا میں خدا کے عظیم تر انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

۱۹۔نجات کا ذریعہ

عائشہ صدیقہ کی ایک طویل روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جس شخص کو لڑکیوں کے ذریعہ کچھ آزمائے پھر وہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ اس کے لیے آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی (من ابتلی من البنات بشیٔ فأحسن الیهن کن له سترا من النّار)

فتح الباری لابن حجر العسقلانی، جلد ۳، صفحہ ۳۳۴ (رقم الحدیث ۱۴۱۸)

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی سبب سے ایک لڑکی اپنے والدین کے لیے سرمایہ (asset) کے بجائے بوجھ (liability) محسوس ہونے لگتی ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم کے مطابق، ایسی لڑکی اپنے ماں باپ کے لیے ایک اور پہلو سے بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ والدین کے لیے آخرت کے زیادہ بڑے انعامات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

تاہم یہ بات اتنی سادہ نہیں۔ یہ دراصل عُسر میں یسر کی ایک صورت ہے۔ والدین اگر ایسی لڑکی کے لیے اچھی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں اور اُس کو زندگی کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل بنائیں تو عین ممکن ہے کہ وہ لڑکی تیار ہوکر اپنے خاندان کے لیے ایک نعمت بن جائے۔ اُس کے ذریعہ سے خاندان میں مثبت طرزِ فکر پروان چڑھے۔ اُس کے ذریعہ سے گھر میں تعمیری ماحول پیدا ہو۔ وہ لڑکی اپنے خاندان کی ایک صحت مند ممبر بن کر خاندان کی ترقی کا ذریعہ بنے۔

اس قسم کا کام ابتدائی طور پر اگرچہ اخروی انعام کے جذبہ کے تحت شروع کیا جاتا ہے مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ خود دنیا کی تعمیر کا بہترین ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خاندان کے لیے مفید ہوتا ہے، دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا کے اعتبار سے بھی۔

۲۰۔ عورتوں سے مشورہ

حسن بصری تابعی نے ستّر سے زیادہ صحابہ کو دیکھا تھا اور اُن سے سُنا تھا۔ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ آپ کا طریقہ تھا کہ آپ کثرت سے مشورہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ عورت سے بھی مشورہ کرتے تھے، اور عورت کبھی ایسی رائے دیتی تھی جس کو آپ قبول کر لیتے (کان النبی ﷺ یستشیر

حتی المرأةَ فتشیر علیه بالتی فیاخذ به)۔عیون الاخبار لابن قتیبہ، جزء ۱، صفحہ ۲۷

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ اُسوہ محدود معنوں میں نہیں ہے۔ وہ وسیع معنوں میں ہے۔ اُس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ کسی کو مشیر کا درجہ دینا اس کو ایک باعزت درجہ دینا ہے۔ ایسی حالت میں عورت کو مشیر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی تعلیم وتربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ معاملات میں مشورہ دینے کے قابل ہو سکے۔ مشورہ لینے میں مشورہ دینے کے قابل بنانا اپنے آپ شامل ہے۔ سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو کوئی عورت (یا مرد) اپنے آپ مشیر نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی تعلیم وتربیت اُس کے مطابق ہو۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام کا مذکورہ اُسوہ اپنے اندر ایک مکمل تصور حیات لیے ہوئے ہے۔ اُس کے اندر سماج کا ایک ایسا نقشہ نظر آتا ہے جس میں تعلیم وتربیت کے اعتبار سے ایسی سرگرمیاں جاری ہوں جو عورتوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ سماج کا ایک صحت مند حصہ بن سکیں۔ وہ اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس قابل ہوں کہ معاملات میں صحیح مشورہ دیں۔ وہ کسی معاملہ میں بحث وتبادلہ (discussion) کے وقت اپنا مفید کردار ادا کر سکیں۔

مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے فطرت کا انمول تحفہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بہترین رفیق ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھیں اور اس کی رعایت کرتے ہوئے ایک دوسرے سے معاملہ کریں۔

مرد فطری طور پر مقابلۃً انا پسند (egoist) ہوتا ہے، اور عورت فطری طور پر مقابلۃً جذباتی (emotional) ہوتی ہے۔ دونوں کے مزاج میں یہ فرق اکثر باہمی اختلاف کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر دونوں اس معاملہ میں باشعور ہوں اور اس فرق کو مسئلہ نہ بننے دیں تو دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس فطری فرق کو مٹا دے۔ اس لیے دونوں ہی کو یہ کرنا ہے کہ وہ فرق سے نپٹنے کا فن (art of difference management) سیکھیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی کو مشترک طور پر کامیاب بنائیں۔

ازدواجی زندگی کے اُصول

کامیاب ازدواجی زندگی کا اصول بھی وہی ہے جو کامیاب انسانی زندگی کا اصول ہے۔ انسانی زندگی کے جو مسائل ہیں وہی ازدواجی زندگی کے مسائل بھی ہیں۔ انسانی زندگی کو کامیاب بنانے کا جو طریقہ ہے ٹھیک اسی طریقہ کو اختیار کر کے ازدواجی زندگی کو بھی کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ فطرت کا ایک ہی قانون ہے اور وہ دونوں ہی قسم کے مسائل کے لئے یکساں طور پر قابل انطباق ہے۔

فطرت کا عمومی قانون

قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو بظاہر مردوں کو خطاب کرتی ہیں مگر اپنے عمومی انطباق (application) کے لحاظ سے ان کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (البلد ۴) اس قرآنی آیت میں بظاہر انسان کا لفظ ہے مگر اس سے مراد مرد اور عورت دونوں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو خدا نے ایک ایسی دنیا میں بسایا ہے جہاں اُنھیں مشقتوں کے ماحول میں اپنی زندگی کا راستہ طے کرنا ہے۔

اس آیت میں خدا نے اپنے تخلیقی نقشہ کو بتایا ہے۔ اس کے مطابق، موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں ہر عورت اور ہر مرد کو پر مشقت جدوجہد کے کورس سے گزرنا ہے۔ زندگی مشقت سے بھری ہوئی جدوجہد کا نام ہے۔ اس سے بچنا نہ کسی عورت کے لئے ممکن ہے اور نہ کسی مرد کے لئے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی مسائل کا نام ہے۔ مسئلہ زندگی کا ایک ایسا لازمی حصہ ہے جس کو اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی عورت یا مرد جب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو کر ازدواجی زندگی کا آغاز کرتے ہیں تو عین اُسی وقت ان کے درمیان مسائل کا بھی آغاز ہو جاتا ہے۔ بے مسئلہ ازدواجی زندگی اس دنیا میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ پھر اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ کون سا فارمولا ہے جس کے

ذریعہ ازدواجی زندگی کو پُرسکون اور خوش گوار بنایا جاسکے۔ وہ فارمولا صرف ایک ہے اور وہ ایڈجسٹمنٹ (adjustment) ہے۔

جب کوئی کسی سے ایڈجسٹ کرتا ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عورت یا مرد کے ساتھ ایڈجسٹ کررہا ہے۔ چنانچہ اُس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ میں اپنے جیسے ایک انسان کے ساتھ کیوں ایڈجسٹ کروں۔ میں کسی کے آگے کیوں جھکوں۔ یہ سوچ کسی عورت یا مرد کے لیے ایڈجسٹمنٹ کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی آدمی جب کسی کے ساتھ ایڈجسٹ کرتا ہے تو اس کا ایڈجسٹ منٹ کسی عورت یا مرد کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ایڈجسٹمنٹ خالقِ فطرت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ دراصل کوئی اور نہیں بلکہ خود خالقِ فطرت ہے جس نے دنیا میں ایسا نظام بنایا جہاں ایڈجسٹمنٹ کے بغیر کوئی اجتماعی کام سِرے سے نہ ہوسکے۔ ایسی حالت میں ایڈجسٹ کرنا گویا خالقِ فطرت کے فیصلہ پر راضی ہونا ہے۔ ایڈجسٹ منٹ کا یہ پہلو اس کو ایک ایسی چیز بنادیتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ خدا کے انعام کا مستحق قرار پائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ایڈجسٹمنٹ یا یک طرفہ جھکاؤ صرف ایک اخلاقی روش نہیں، وہ ایک عبادت ہے۔ وہ خدا کی خدائی کا اعتراف کرنا ہے۔ ایڈجسٹمنٹ خدا کے حقوق میں سے ایک حق ہے اور اسی جذبہ کے تحت اس کو اختیار کرنا چاہیے۔

مثبت سوچ کی ضرورت

خاندانی زندگی میں مسائل کا سبب عام طور پر صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ ہے منفی سوچ (negative thinking) ۔ ایسی حالت میں گھریلو مسائل کے خاتمہ کا سنگل پائنٹ فارمولا (single point formula) یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے اندر مثبت سوچ (positive thinking) کی صفت پیدا کی جائے۔ مثبت سوچ کسی عورت یا مرد کو اونچی سوچ والا بناتی ہے، اور جن لوگوں کے اندر اونچی سوچ آجائے وہ اپنے آپ چھوٹی باتوں میں الجھنا چھوڑ دیں گے۔ وہ زندگی

گذارنے کے لیے تلخیوں اور شکایتوں سے بُلند ایک سطح پالیں گے۔

فطرت کی تقسیم کے مطابق، ایسا ہے کہ ایک عورت یا ایک مرد کو ہر چیز نہیں ملتی۔عملاً یہ ہوتا ہے کہ ایک کو کوئی چیز ملتی ہے اور دوسرے کو کوئی اور چیز۔اب یہ ہوتا ہے کہ جو چیز کسی کو ملی ہے وہ اس کو اپنا حق سمجھ لیتا ہے، اور کوئی چیز جو دوسرے کو ملی ہے اس کے متعلق اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ مجھ کو نہیں ملی تو وہ دوسرے کو بھی نہیں ملنی چاہئے تھی۔اس سوچ کے نتیجہ میں حسد اور جلن جیسے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو تعلقات کو بگاڑنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

قرآن کے مطابق، اس دنیا میں ہر چیز آزمائش کا پرچہ (test paper) ہے۔اگر یہ ذہن ہو تو مذکورہ قسم کی منفی نفسیات کی جڑ کٹ جائے گی۔ایسی حالت میں عورت یا مرد یہ سمجھیں گے کہ جو چیز میرے پاس ہے وہ میرے لیے ایک امتحانی پرچہ ہے اور جو چیز دوسرے کے پاس ہے وہ بھی اس کے لیے ایک امتحانی پرچہ ہے۔اس لئے میرا دھیان تمام تر اس پر ہونا چاہئے کہ میں اپنے امتحان میں فیل نہ ہوں۔میں اپنے آزمائشی پرچہ میں خدا کی نظر میں ناکام نہ ٹھہروں۔عورت اور مرد کے اندر اگر یہ فکر ہو تو اکثر خاندانی برائیوں کی جڑ اپنے آپ کٹ جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مثبت سوچ (positive thinking) تمام خوبیوں کی جڑ ہے، اور اس کے مقابلہ میں منفی سوچ (negative thinking) تمام برائیوں کی جڑ۔تاہم یہ سادہ معنوں میں صرف ایک اخلاقی روش کی بات نہیں۔وہ ایک مومن کے ایمان کی پہچان ہے۔مومن وہ ہے جو خدا کو معرفت کے درجہ میں پالے۔جس کو خدائے برتر کی دریافت ہو جائے۔ایسے انسان کی پہچان یہ ہے کہ اس کے اندر تخلقوا بأخلاق اللّٰہ کا مزاج آجاتا ہے۔مثبت طرزِ فکر اس کی غذا بن جاتا ہے۔اس کے مقابلہ میں منفی طرزِ فکر کو اس کی روح قبول نہیں کرتی۔وہ منفی طرزِ فکر سے اسی طرح دور ہو جاتا ہے جس طرح ایک خوش ذوق انسان بدذوقی کی باتوں سے۔

عورت اور مرد

عورت اور مرد کا رشتہ بے حد نازک رشتہ ہے۔اس معاملہ میں ایک غلطی کسی کی پوری زندگی کو

تباہ کرسکتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے عورتوں کوخطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے گروہ خواتین، میں نے کسی کونہیں دیکھا جوعقل اور دین میں کم ہونے کے باوجود وہ کسی دانشمند آدمی کی عقل کو اس طرح کھا جائے جس طرح تم عورتوں میں سے کوئی عورت کسی مرد کی عقل کو کھا جاتی ہے۔

صحيح البخاری، كتاب الزكاة، باب الزكاة على الأقارب (رقم الحديث ۱۴۶۲)

فتح الباری لابن حجر العسقلانی ۳/ ۳۸۱۔

اس حدیث میں عورت بحیثیت جنس مراد نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر پیدا ہونے والی عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد بعض عورتیں ہیں۔ یعنی عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی ہوتی ہے جوکسی مرد کی عقل کو اس طرح گُم کردے کہ وہ اپنی ساری دانش مندی کے باوجود بے عقل بن کر رہ جائے۔

یہ عورت کون ہے۔ یہ عورت وہ ہے جس کی خود غرضی اس کے انصاف کے جذبہ پر غالب آجائے۔ وہ مرد کو مشورہ دیتے ہوئے سنجیدگی، دیانت داری اور انصاف کے تقاضوں کو بھول جائے اور صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے مرد کو غلط مشورے دے۔ ایسی عورت سماج کے لیے ایک مصیبت ہے۔ وہ اپنی اس منفی صفت سے اپنے آپ کو جنت کے لیے نااہل بنا رہی ہے۔

کوئی عورت یہ کام اپنے حقیر مفادات کے لیے کرتی ہے۔ وہ مرد کے ذہن کو خاموشی کے ساتھ متاثر کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ مرد بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے حقیر مفادات میں اس کے ساتھ شریک ہوجاتا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے بہترین عقل لے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ علم وعمل کی دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ مگر عورت کے فریب میں آکر اس کے اندر ذہنی ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔ اس کے لیے عملاً یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ کسی بڑی بات کے لیے سوچے، وہ کسی بڑے مقصد کو اپنا نشانہ بنائے۔ حالانکہ زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو مقصدِ اعلیٰ سے کمتر کسی چیز میں استعمال کیا جائے۔

خدا پر بھروسہ

قرآن میں طلاق کے ذکر کے تحت کچھ نصیحتیں کی گئی ہیں۔ یہ نصیحتیں قرآن کی سورہ نمبر ۶۵ میں آئی ہیں۔ متعلقہ آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اے پیغمبر، جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت پر طلاق دو اور عدت کو گنتے رہو، اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے۔ ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، اِلا یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کریں، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور جو شخص اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، تم نہیں جانتے شاید اللہ اس طلاق کے بعد کوئی نئی صورت پیدا کردے۔ پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو ان کو یا تو معروف کے مطابق رکھ لو یا معروف کے مطابق ان کو چھوڑ دو اور اپنے میں سے دو معتبر گواہ کر لو اور ٹھیک ٹھیک اللہ کے لئے گواہی دو۔ یہ اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کے لیے راہ نکالے گا، اور اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ گیا ہو، اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کے لئے کافی ہے، بے شک اللہ اپنا کام پورا کرکے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔ (الطلاق ۱-۳)

طلاق شوہر اور بیوی کے درمیان ایک بحران (crisis) کی حالت ہے۔ اس طرح کے چھوٹے یا بڑے کرائسس خاندانی زندگی میں برابر آتے رہتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں ایک اہم نصیحت کی گئی ہے جو کرائسس مینجمنٹ (crisis management) کے لئے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بنیادی اصول قرآن کے لفظ میں توکل ہے، یعنی ہر صورت حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا اور معاملہ کو پوری طرح اللہ کے اوپر ڈال دینا۔

بحران دراصل اس حالت کا نام ہے جب کہ کسی عورت یا مرد کے سامنے ایک ایسی صورت حال آجائے جس میں وہ بظاہر اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہو۔ اگر مسئلہ ایسا ہو جس کو حل

کرنا اس کے اختیار میں ہوتو ایسا مسئلہ اس کے لئے وہ چیز نہیں بنے گا جس کو بحران کہتے ہیں۔ بحران صرف اس صورت حال کا نام ہے جب کہ وہ یہ محسوس کرے کہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اس کی دستیاب صلاحیت کافی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں، اپنی محدودیت (limitations) کے احساس کا نام بحران ہے۔

ایسی حالت میں اگر عورت یا مرد کا ذہن اپنی محدودیت پر لگا رہے تو وہ صرف اپنی پریشانی میں اضافہ کرے گا۔ ایسی حالت میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے دائرہ میں جو کرسکتا ہے وہ کرے اور بقیہ کو خدا کے خانہ میں ڈال دے۔ وہ معتدل انداز میں اپنی کوشش کرتے ہوئے انجام کے معاملہ میں خدا کی ذات پر بھروسہ کرے۔

اس طریقہ کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ متعلقہ عورت یا مرد کا ذہن فوری طور پر معتدل ہوجاتا ہے، یہ چیز اس کو منفی سوچ سے ہٹا کر مثبت سوچ کی طرف موڑ دیتی ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہوجاتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طور پر مسئلہ کے حل کے لئے استعمال کرسکے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت کے نظام کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ انسانی جسم کے اندر یہ نظام ہے کہ اس میں کوئی خلل واقع ہوتو فوراً پورا جسم اس کو درست کرنے کے لئے متحرک ہوجاتا ہے۔

یہی معاملہ وسیع تر زندگی کا بھی ہے۔ زندگی میں جب کوئی بحران پیدا ہوتو فطرت کا نظام فوراً اس کی درستگی کے لئے حرکت میں آجاتا ہے۔ ایسی حالت میں اللہ پر توکل کرکے اپنے کو تھام لینا گویا فطرت کے نظام کو اپنا کام کرنے کا موقع دینا ہے، یہ موقع کہ وہ متحرک ہوکر معاملہ کو درست کردے۔

بحران کے حل کا یہ فارمولا بلاشبہ ایک کامیاب فارمولا ہے۔ وہ ہر صورت حال میں قابل استعمال ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ عورت یا مرد پر جب بھی ایسی کوئی چھوٹی یا بڑی صورت حال پیش آئے تو وہ سوچے۔ ایسے موقع پر وہ سوچ سے اپنے عمل کا آغاز کرے، نہ کہ اقدام سے۔ یہی کرائسس مینجمنٹ کا سب سے زیادہ کارگر فارمولا ہے۔

والدین فطری معلم

ماں اور باپ اپنی اولاد کے فطری معلم ہیں۔ قرآن و حدیث میں ماں اور باپ کی اطاعت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ (اپنے والدین کو) اُف نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور ان کے سامنے نرمی سے عجز کے بازو جھکا دو (بنی اسرائیل ۲۳-۲۴) اسی طرح حدیث میں والدین کے عزت واحترام کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ماں اور باپ اپنی اولاد کے سب سے بڑے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ ان سے بہتر ناصح اور کوئی نہیں۔ اسی لئے اسلام کا یہ منشا ہے کہ اولاد کے اندر اپنے باپ اور ماں کے لئے انتہائی عزت واحترام کا ماحول پیدا کیا جائے تاکہ ماں باپ کی طرف سے آنے والی ہر نصیحت کو وہ دل کی گہرائی کے ساتھ قبول کرسکیں۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ اپنے بچپن کی عمر میں ایک نا تجربہ کار شخص ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اس کے ماں باپ کی حیثیت تجربہ کار سرپرست کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں اور باپ ہر پیدا ہونے والے عورت اور مرد کے سب سے بہتر معلم اور مربی ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں کے حق میں ماں باپ کی محبت اس تعلق کو مزید اہم بنا دیتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے مسائل کا قریبی فطری حل یہ ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے والدین کو اپنا ازدواجی مشیر بنالیں۔ کیوں کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی جس ازدواجی زندگی کو شروع کرنے جارہے ہیں اُس ازدواجی زندگی کا تجربہ اُن کے والدین پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اس معاملہ میں والدین اُن کے لیے ایسے صحیح مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں جو اُن کے سچے خیر خواہ بھی ہیں، اور اسی کے ساتھ وہ اُس زندگی کا عملی تجربہ بھی کر چکے ہیں جس کی بابت اُنھیں مشورہ کا کام انجام دینا ہے۔ تاہم والدین اپنی اس ذمہ داری کو صرف اس وقت ادا کر سکتے ہیں جب کہ ان کا مشورہ صرف محبت اولاد کے جذبہ کے تحت نہ ہو بلکہ وہ تجربات کی روشنی میں حقیقت پسندانہ مزاج کے تحت ہو۔ کامیاب زندگی کا سب سے بڑا راز حقیقت پسندی ہے۔

سب عورتیں یکساں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کبھی شیطان کی صورت میں آگے آتی ہے اور کبھی وہ شیطان کی صورت میں پیچھے جاتی ہے۔ جب تم میں سے کوئی شخص کسی غیر عورت کو دیکھے اور وہ اُس کو پسند آئے اور وہ اُس کے دل میں اُتر جائے تو وہ اپنی بیوی کا قصد کرے اور وہ اُس سے ملے کیوں کہ اس کی وجہ سے اُس کے دل میں جو ہے وہ اُس سے نکل جائے گا۔

صحیح مسلم، بحوالہ مشکاۃ المصابیح، کتاب النکاح (رقم الحدیث ۳۱۰۵)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی غیر عورت کو دیکھے اور وہ اُس کو اچھی لگے تو وہ اپنی بیوی کے پاس چلا جائے۔ کیوں کہ اُس کے پاس بھی وہی ہے جو دوسری عورت کے پاس ہے۔

سنن الدارمی، بحوالہ مشکاۃ المصابیح، کتاب النکاح (رقم الحدیث ۳۱۰۸)

ان روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خوبصورتی دراصل جنت کی چیز ہے، اور وہ جنت ہی میں کسی خوش نصیب انسان کو ملے گی۔ خوبصورتی موجودہ دنیا کی چیز ہی نہیں۔ اگر کوئی مرد کسی غیر عورت کو دیکھے اور وہ اس کو اچھی لگے تو سمجھ لیجیے کہ یہ شیطان کا فریب تھا۔ شیطان کا یہ فریب صرف اُس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک وہ عورت اُس کو بیوی کی حیثیت سے نہ ملے۔ بیوی کی حیثیت سے ملنے کے بعد شیطان کا خوش نما پردہ اُس سے ہٹ جاتا ہے اور وہی عورت اُس کو ایک عام عورت دکھائی دینے لگتی ہے جو پہلے اُس کو دل کش صورت میں دکھائی پڑی تھی۔

ایسی حالت میں ہر عقلمند آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ جب وہ کسی اجنبی عورت کو دیکھے اور وہ اُس کو اچھی لگے تو وہ اُس کو نظر کا دھوکہ سمجھے۔ وہ واپس ہو کر اپنی بیوی کے پاس آجائے۔ کیوں کہ فطرت کی تخلیق کے مطابق، اُس کی اپنی بیوی کے پاس بھی وہی نسوانیت ہے جو اُس کو اجنبی عورت کے یہاں نظر آئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ بظاہر ایک غیر خوبصورت عورت بھی اُسی طرح کی ایک نسوانی شخصیت ہے جیسا کہ بظاہر ایک خوبصورت عورت۔ جدید دنیا میں لومیریج کے باوجود طلاق کی کثرت کا سبب یہی ہے۔ جب یہ لوگ شادی سے پہلے بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کی حیثیت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ایک فریب نظر کے تحت دونوں غیر حقیقی طور پر ایک دوسرے کو خوبصورت سمجھ لیتے ہیں۔ مگر جب یہی لوگ شادی کے بعد بوائے ہزبنڈ اور گرل وائف کی حیثیت سے ایک دوسرے کو پا کر ایک ساتھ رہنا شروع کرتے ہیں تو جلد ہی پچھلی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُکتا کر وہ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔

جو عورت یا مرد اس حقیقت کو جان لے وہ فریب نظر میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنالیں گے کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں گزاریں، وہ اپنی زندگی کو زیادہ بامعنیٰ زندگی بنا سکیں۔

بدگمانی فساد کی جڑ

قرآن میں ظن (گمان) سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعض ظن گناہ ہوتے ہیں (الحجرات-۱۲) حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم گمان سے بہت زیادہ پرہیز کرو۔ کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

(قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم إیا کم و الظن فإن الظن أکذب الحدیث)

صحیح البخاری، کتاب الوصایا فتح الباری لابن حجر العسقلانی جلد ۵، صفحہ ۴۴۱۔

انسانی تعلقات میں بگاڑ کا سب سے بڑا سبب بدگمانی ہوتا ہے۔ خاندانی زندگی ہو یا سماجی زندگی، ہر جگہ جب تعلقات بگڑتے ہیں تو اس کا سبب زیادہ تر بدگمانی ہوتا ہے۔ خواہ تعلقات کا یہ معاملہ شوہر اور بیوی کے درمیان ہو یا وسیع تر معنوں میں سماجی افراد کے درمیان۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک سے دوسرے کو کوئی بات پہنچتی ہے تو تقریباً

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ بات اپنی ٹھیک ٹھیک صورت میں نہیں پہنچتی بلکہ وہ بیان کرنے میں گھٹ جاتی ہے یا بڑھ جاتی ہے۔ اب سننے والا یہ کرتا ہے کہ وہ جو کچھ سنتا ہے اس کو اسی طرح مان لیتا ہے۔ اسی سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور تعلقات میں بگاڑ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں صحیح اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں اچھی بات معلوم ہو تو اس کو بلا تحقیق مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں بری بات کہے تو ایسی بات کو بلا تحقیق نہیں ماننا چاہئے۔ بری بات کو یا تو سن کر اپنے دماغ سے نکال دینا چاہئے یا پھر اس وقت اس کو ماننا چاہئے جب کہ اس کے بارے میں ہر قسم کی ضروری تحقیق کر لی گئی ہو۔

بدگمانی کا ایک سبب اور ہے، وہ یہ کہ بیوی اپنے شوہر کی کسی بات کو دیکھے یا شوہر اپنی بیوی کی کسی بات کو دیکھے اور اس پر وہ مزید تحقیق کے بغیر ایک رائے قائم کر لے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس قسم کا مشاہدہ ہمیشہ جزئی ہوتا ہے، کوئی بھی مشاہدہ مکمل مشاہدہ نہیں ہوتا۔ ایسے حالات میں صرف ایک مشاہدہ پر رائے قائم کرنا اکثر اوقات سخت غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ جب بھی آپ کسی کے بارے میں کوئی مشاہدہ کریں اور اس مشاہدہ کا کوئی برا پہلو آپ کے ذہن میں آ رہا ہو تو ایسے مشاہدہ کی بنیاد پر کبھی یک طرفہ طور پر رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح کے معاملہ میں ضروری ہے کہ مشاہدہ کرنے والا اپنے ساتھی سے اس کی مزید تفصیل دریافت کرے اور ساتھی کو چاہئے کہ وہ برا مانے بغیر اس کو پوری بات بتائے۔ ایسا طریقہ اختیار کرنے سے ابتداء ہی میں فساد کی جڑ کٹ جائے گی اور مشاہدہ کسی سنگین نتیجہ تک نہیں پہنچے گا۔

خوش گمانی یا بدگمانی اسلام میں صرف ایک اخلاقی صفت نہیں۔ اس کی اہمیت اس سے زیادہ ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، بدگمانی ایک ایسی برائی ہے جو آدمی کو خدا کی رحمت سے محروم کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں خوش گمانی ایک ایسی نیکی ہے جو کسی عورت یا مرد کو خدا کی رحمت کا مستحق بناتی ہے، اور آخر کار اُس کو ابدی جنت میں پہنچا دیتی ہے۔ خوش گمانی اگر جنت کا ٹکٹ ہے تو بدگمانی جہنم کا ٹکٹ۔

ابوہریرہ کی ایک روایت ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی بہن (سوکن) کے طلاق کے لیے اپنے شوہر سے مطالبہ کرے تاکہ وہ اُس کے پیالہ کو خالی کرلے (اوراپنا پیالہ بھرلے) کیوں کہ اُس کے لیے وہ ہے جو اُس کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ (**لا یحل لا مرأة لتسأل طلاق اختها لتستفرغ صحفتها فانما لها ما قدر لها**) **صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الشروط التی لا تحل فی النکاح (رقم الحدیث ۵۱۵۲)**

ابن عبدالبر نے اس حدیث میں اخت (بہن) سے مراد سوکن کو لیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی عورت کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ اپنے شوہر سے اپنی سوکن کے طلاق کا مطالبہ کرے تاکہ وہ اکیلی ہی اپنے شوہر کی بیوی بن جائے (**فتح الباری لابن حجر العسقلانی، ۹/۱۲۷**)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عورت کے ساتھ اگر مذکورہ قسم کا معاملہ پیش آئے، یعنی وہ ایک شوہر کی دوسری بیوی ہو تو ایسی صورت میں اس کو کیا کرنا چاہئے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو منفی نفسیات سے مکمل طور پر بچائے۔ وہ صورت حال کو پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کرے۔ کیوں کہ دونوں کو وہی ملے گا جو ان کے لئے مقدر کردیا گیا ہے۔ دونوں میں سے کوئی نہ کسی کے حصہ میں سے کچھ لے سکتا ہے اور نہ کسی کے حصہ میں کچھ کمی کرسکتا ہے۔ اس کی منفی تدبیروں کے بعد بھی وہی ہوگا جو ہونے والا تھا، نہ کہ وہ جس کو اس نے اپنے منفی جذبات کے تحت اپنے یا دوسرے کے لئے چاہا تھا۔

ایسی حالت میں مذکورہ قسم کی عورت کے لیے جو صحیح روش ہے وہ قناعت اور خدا پر بھروسہ ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ پیش آمدہ صورت حال کو خدا کا فیصلہ سمجھ کر اس کو قبول کرے، نہ کہ بے فائدہ طور پر اس کو بدلنے کی کوشش کرے۔

مستقبل کی طرف دیکھنا

شوہر اور بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے بعض مسائل کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ایک نصیحت آئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: خدا کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اتنا ہی جتنا کہ اُس نے اس کو دیا ہے، خدا سختی کے بعد جلد ہی آسانی پیدا کردے گا (الطلاق-۷)

قرآن کی یہ آیت ازدواجی زندگی کی ایک اہم حکمت کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ اختلافی معاملات میں صرف حال (present) کی بنیاد پر رائے قائم نہ کرنا بلکہ مستقبل (future) کو سامنے رکھ کر اپنی رائے بنانا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب ازدواجی زندگی میں کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ صرف حال کو دیکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ جو صورت حال آج ہے وہی کل باقی رہنے والی نہیں۔

حال میں سوچنا کسی عورت یا مرد کے اندر محدود طرز فکر پیدا کرتا ہے۔ اس سے مایوسی اور جھنجھلاہٹ کا مزاج بنتا ہے۔ اس سے برتر سوچ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ ایسے لوگ برداشت کی ربانی صفت سے محروم رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ برداشت کرنا اپنی محرومی کو قبول کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔

اس کے برعکس مستقبل کو سامنے رکھ کر سوچنا مرد اور عورت کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش کرنا ہے۔ ایسے لوگ کبھی ناامید نہیں ہوتے۔ کیوں کہ ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ جو چیز انھیں آج نہیں مل رہی ہے وہ انھیں بدلے ہوئے حالات میں کل مل جائے گی۔ مستقبل بینی لوگوں کے اندر اعلیٰ ظرفی کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کی نظر ہمیشہ زیادہ بڑی چیزوں پر ہوتی ہے، اس لئے چھوٹی چیزوں کا نقصان انہیں کوئی نقصان نظر نہیں آتا۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں شوہر اور بیوی کے درمیان پیدا ہونے والی نزاع کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی

حرج نہیں کہ دونوں آپس میں صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے۔ (النساء-۱۲۸) صلح کا مطلب مصالحت ہے۔ اس کا الٹا ٹکراؤ ہے۔ قرآنی طریقہ یہ ہے کہ نزاع کے وقت مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے نہ کہ ٹکراؤ کا طریقہ۔

عورت اور مرد کے درمیان نزاع کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ مختلف وجوہ سے کسی معاملہ میں ایک کی رائے دوسرے کی رائے سے مختلف ہوجاتی ہے۔ ایک کچھ چاہتا ہے اور دوسرا کچھ۔ اب یہ ہوتا ہے کہ دونوں کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر ایک یہ چاہنے لگتا ہے کہ میری بات چلے۔ وقتی احساس کے تحت ایک کا ذہن یہ ہوجاتا ہے کہ میں صحیح ہوں اور دوسرا غلط۔ ایسے موقع پر بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنی بات پر اصرار کرنے کے بجائے ٹھہر کر سوچا جائے۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے کہ — سوچئے، ضرور کوئی بہتر راستہ سامنے آجائے گا:

Think, think, there must be a better way.

سوچنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ذہنی سانچہ سے باہر آکر دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ معاملہ پر نتیجہ کے اعتبار سے غور کیا جائے۔ صحیح اور غلط کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ عملی طور پر کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں ہوسکتا۔ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ چھوٹا شر (lesser evil) کیا ہے اور بڑا شر (greater evil) کیا ہے اور پھر چھوٹے شر کو قبول کرلیا جائے۔ اور ایسے اقدام سے پرہیز کیا جائے جو بڑا شر پیدا کرنے والا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر مسئلہ سوچ کی سطح پر پیدا ہوتا ہے، اور سوچ کی سطح پر ہی اُس کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ سوچ بلاشبہ کسی عورت یا مرد کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ سوچ کی سطح پر ہارنے کا نام ہار ہے، اور سوچ کی سطح پر جیتنے کا نام جیت۔

عورت کی سب سے بڑی کمزوری

عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کی اولاد ہے۔ کہانیوں میں عورت کو محبت کی علامت

بتایا گیا ہے۔ مگر یہ صرف محدود معنوں میں ہے۔ عملی طور پر دیکھئے تو عورت محبتِ اولاد کی علامت ہے، نہ کہ محبت انسان کی علامت۔ عورت کے دل میں خدا نے محبت کا گہرا جذبہ پیدا کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ محبت کا یہ جذبہ پوری انسانیت تک پھیل جائے۔ مگر عملاً عورت نے اس کو اپنی اولاد کی محبت تک محدود کر دیا۔

عورت کی اس کمزوری کو ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ حدیث عام طور پر حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مطابق، فرشتہ جبریل، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسان کی صورت میں آئے۔ اُن کی اس آمد کا مقصد تعلیمِ دین تھا۔ اس کا طریقہ اُنھوں نے یہ اختیار کیا کہ وہ سوالات کرتے رہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے دیے ہوئے علم کے مطابق، ان کا جواب دیتے رہے۔

ایک سوال میں فرشتہ نے پوچھا کہ قیامت کی علامتیں کیا کیا ہیں۔ اس کے جواب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علامتیں بتائیں اُن میں سے ایک علامت یہ تھی کہ جب عورت اپنا آقا جنے (**اذا ولدت الأمة ربّها**)

صحیح البخاری، کتاب الایمان (رقم الحدیث ۵۰)

''عورت اپنا آقا جنے گی'' کا مطلب یہ ہے کہ عورت خود اپنے پیدا کیے ہوئے بیٹے کی محبت میں اتنا زیادہ مغلوب ہو جائے گی اور اس طرح اس کی بات ماننے لگے گی گویا کہ وہ اس کا حاکم ہے اور وہ خود اس کی محکوم۔ عورت کے اندر یہ کمزوری ہمیشہ سے رہی ہے۔ مگر قیامت کے قریب اُس کا یہ مزاج بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ قیامت کی قربت سے مراد غالباً وہ زمانہ ہے جو صنعتی انقلاب کے بعد آیا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد بعض ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں جن میں اولاد کی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے اور ماں اور باپ ہمیشہ سے زیادہ اپنی اولاد کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ اپنا سارا اثاثہ صرف اپنی اولاد کے اوپر خرچ کر دینا چاہتے ہیں۔

اس صورت حال نے، خاص طور پر موجودہ زمانہ میں، عورت سے اس کا سب سے بڑا امتیاز

چھین لیا ہے۔ عورت اپنی مختلف صلاحیتوں کی بنا پر اس قابل ہے کہ وہ وسیع تر انسانیت کے لیے ایک عظیم خدمت انجام دے سکے۔ وہ پوری انسانیت کے لیے معلّم اور معمار بن جائے۔ مگر اولاد کی بڑھی ہوئی محبت، صحیح تر الفاظ میں، بے جا محبت نے اُس کو اس معاملہ میں آفاقی رول ادا کرنے کے قابل نہیں رکھا۔ عملاً یہ ہوا کہ اُس کی زندگی اپنے بیٹے کے لاڈ پیار سے شروع ہوتی ہے اور آخر کار اُسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عورت اس سے قاصر رہ گئی کہ وہ آفاقی معنوں میں انسانیت کی کوئی اعلیٰ تعمیر کر سکے۔ جس عورت کو محبت کی علامت بتایا گیا تھا وہ صرف محبتِ فرزند کی علامت بن گئی، نہ کہ عمومی معنوں میں محبتِ انسان کی علامت۔

غصہ کو بھلانا

قرآن میں ایمان والوں کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ اس کو معاف کر دیتے ہیں (الشوریٰ ۳۷) ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کے ساتھ میں جیوں۔ اور وہ بات لمبی نہ ہو کہ میں اس کو بھول جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم غصہ نہ کرو۔

(عن حمید بن عبدالرحمن بن عوف، أن رجلاً أتى إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: يا رسول اللّٰه علمنى كلمات أعيش بهن، ولا تكثر على فأنسى، فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: "لا تغضب")

موطا الامام مالک، کتاب الجامع، صفحه ۶۵۲ (رقم الحدیث ۱۶۳۷)

یہاں سوال کرنے والے نے گویا یہ پوچھا تھا کہ زندگی کے معاملات کو درست طور پر چلانے کے لئے جامع نصیحت (master advice) کیا ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں ماسٹر فارمولا غصہ نہ کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کامیاب زندگی کا راز اس چیز میں ہے جس کو آرٹ آف اینگر مینجمنٹ (art of anger management) کہا جا سکتا ہے۔

غصہ ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر عورت اور مرد کو کبھی نہ کبھی کسی بات پر غصہ آجاتا ہے۔ غصہ کے وقت عورت یا مرد کے ذہن میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ قابو سے باہر ہوجاتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ جو کچھ اس کے بس میں ہے وہ سب کر ڈالے۔ تاہم یہ ایک وقتی جذبہ ہوتا ہے۔ اگر آدمی غصہ کے تناؤ کو ڈیفیوز کرنے کی کوشش کرے تو صرف ایک دو منٹ میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا اور وہ نارمل آدمی کی طرح بن جائے گا۔

غصہ کا جواب غصہ سے دینا گویا منفی بات کا منفی انداز میں جواب دینا ہے۔ یہ صحیح انسانی طریقہ نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی کی طرف سے منفی بات آئے تب بھی اس کا جواب مثبت انداز میں دیا جائے۔

منفی بات کا مثبت انداز میں جواب دینا کسی اور کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنے لئے ہوتا ہے۔ جب آپ غصہ ہوجائیں یا منفی احساس آپ کے اندر بھڑک اٹھے تو اس وقت آپ شدید ذہنی انتشار میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ آپ کا ذہنی عمل رک جاتا ہے۔ یہ آپ کا خود اپنا مسئلہ ہے۔ ایسی حالت میں غصہ کے جواب میں غصہ نہ کرنا یا اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا ایک ایسی روش ہے جس کا فائدہ سب سے پہلے خود آپ کو ملتا ہے۔ ایسی روش خود اپنے آپ کو بچانے کے ہم معنیٰ ہے۔ کیوں کہ آپ کو اس کا نتیجہ اس طرح ملتا ہے کہ آپ کے اندر ذہنی ارتقاء کے عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ آپ کا روحانی سفر رکے بغیر برابر جاری رہتا ہے۔

عورت کا کمتر استعمال

یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ بیشتر مرد ایک مشترک غلطی کا شکار ہوئے ہیں، اور وہ ہے عورت کا کمتر استعمال (under-use) ۔ ہر عورت امکانی طور پر اپنے شوہر کی بہترین ذہنی رفیق (intellectual partner) ہے اور ذہنی رفیق بلاشبہ کسی مرد کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ مگر بیشتر مرد اپنے اس اثاثہ کو اس کی اعلیٰ صورت میں استعمال نہیں کر پاتے۔ وہ اس کا صرف کمتر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں مر کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

عورت اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کو پسند کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مزین کرے (الزخرف ۱۸) مرد کا یہ کام ہے کہ وہ اس مزاج کو ایک صحت مند موڑ دے۔ وہ تزئین جسمانی کے مزاج کو تزئین ذہنی کی طرف موڑ دے۔ تاکہ عورت اس کی زندگی میں ذہنی رفیق کا رول ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔

لیکن مرد ایسا نہیں کرتا۔ وہ عورت کے مزاج کو خود اپنی تفریح کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ وہ خود بھی عورت کو خوش نما صورت میں دیکھنے کا خواہشمند بن جاتا ہے۔ وہ عورت کو صرف ایک ذریعۂ مسرت (source of pleasure) کے طور پر لے لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت اپنی ساری عمر بس اپنے جسم کو سنوارنے میں لگی رہتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں بنتی کہ اپنے ذہنی امکانات کو ترقی دے کر اپنے آپ کو اس کا اہل بنائے کہ وہ اپنے شریک حیات کے لئے اعلیٰ درجہ کی ذہنی رفیق بن سکے۔

اس معاملہ میں ایک حدیث سے رہنمائی ملتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنی دنیا سے محبت کی وہ اپنی آخرت کا نقصان کرے گا، اور جس نے اپنی آخرت سے محبت کی وہ اپنی دنیا کا نقصان کرے گا۔ پس تم فنا ہونے والی چیز پر اس کو ترجیح دو جو باقی رہنے والی ہے (من أحب دنیاه أضرّ بآخرته و من أحب آخرته أضرّ بدنیاه فآثروا ما یبقی علی ما یفنیٰ)

مسند الامام احمد، جلد ۴، صفحہ ۴۱۲۔

اس حدیث میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں ایک چیز کو لینے کے لئے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہی اصول ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی درست ہے۔ کوئی مرد اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنا ذہنی رفیق بنائے تو اس کو یہ قربانی دینی پڑے گی کہ وہ عورت کی جسمانی خوش نمائی کو چھوڑ کر اس کی ذہنی ترقی کا شائق بنے۔ اسی قربانی کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ کسی مرد کے لئے اس کی عورت اعلیٰ تر معنوں میں اس کی ذہنی رفیق بن جائے۔ یہ قربانی صرف قربانی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے چھوٹے فائدہ کو نظر انداز کر کے بڑے فائدہ کو اپنے لیے لے لیا۔

نکاح میں ولی کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں(لا نکاح إلا بو ليّ) **احمد، الترمذی، ابو داؤد، ابن ماجه، الدارمی، بحواله مشکاۃ المصابیح، جلد ۲، صفحه ۹۳۸ (رقم الحدیث ۳۱۳۰)**

اس حدیث میں ولی کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ اعتقادی حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک عملی ضرورت کی ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ولی کی موجودگی یا اس کی رضامندی کے بغیر جو نکاح کیا جائے وہ شرعی اعتبار سے جائز نکاح نہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کامیاب نکاح کی ایک عملی شرط یہ ہے کہ وہ ولی کی شرکت کے ساتھ ہو۔ ولی کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، خاندانی بزرگ ہے۔ نکاح عام طور پر نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکی کے درمیان ہوتا ہے جن کو ابھی زندگی کا عملی تجربہ نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ خاندانی بزرگ کا تجربہ اس تعلق میں شامل ہو جو گویا شادی کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس معاملہ میں دونوں طرف سے غلطیاں ہوئی ہیں جس نے اس ہدایت کو عملاً غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ ایک طرف یہ ہوا کہ ولی یا خاندان کے بزرگ نے اپنے اختیار کو غلط طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً وہ لڑکے اور لڑکی کی مرضی جانے بغیر، حتیٰ کہ ان کی مرضی کے خلاف جبری نکاح کروانے لگے۔ حالاں کہ حدیث میں واضح طور پر اس کو منع کیا گیا ہے۔ حدیث کے مطابق، یہ ضروری ہے کہ ولی حضرات اپنی حیثیت کا استعمال کرتے ہوئے لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کو بھی ضرور ملحوظ رکھیں۔ وہ لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کو نظر انداز کر کے ان کا نکاح نہ کریں۔

ولی حضرات نے، خاص طور پر روایتی معاشرہ میں، مزید یہ بھیانک غلطی کی کہ انھوں نے شادی کے ساتھ جہیز کو ایک لازمی جزء کے طور پر شامل کر دیا۔ لڑکے کا باپ اپنے لڑکے کی شادی کے لئے لڑکی والوں سے بڑے بڑے جہیز کا مطالبہ کرتا ہے۔ خاندانی سرپرستوں میں یہ مزاج اتنا زیادہ بڑھا کہ شادی کو انھوں نے گویا خرید و فروخت کا ایک معاملہ بنا دیا۔ یہ طریقہ بلاشبہ غیر شرعی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ

ہوگا کہ آج کل جس قسم کے جہیز کا رواج پڑ گیا ہے وہ ایک تباہ کن سماجی برائی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ نکاح بالکل سادہ طریقہ پر کیا جائے۔ بھاری جہیز، بڑی بڑی مہر، رسوم و رواج کی دھوم کو مطلق طور پر ختم کردینا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں بدعت ہیں، اور بدعت سے کبھی خیر کی امید نہیں کی جاسکتی۔

دوسری طرف آج کل کے لڑکوں اور لڑکیوں میں ایک باغیانہ رجحان ابھرا ہے۔ وہ ولی یا خاندانی بزرگ کو نظر انداز کرکے آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے براہِ راست تعلق قائم کرتے ہیں اور پھر ولی کی رضامندی کے بغیر بطور خود آپس میں شادی کر لیتے ہیں۔ اس طریقہ کو عام طور پر محبت کی شادی (love marriage) کہا جاتا ہے۔

مگر تجربہ بتاتا ہے کہ محبت کی شادی آخرکار نفرت کی شادی بن جاتی ہے۔ سروے کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ جدید معاشرہ میں پچاس فیصد سے زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ محبت کی شادیاں آخرکار تفریق اور طلاق پر ختم ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی وجہ سے طلاق نہ ہو تب بھی شوہر اور بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنا بگاڑ آجاتا ہے کہ وہ پرسکون زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس تجربہ کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ محبت کی شادی (love marriage) دراصل شہوت کی شادی (lust marriage) تھی جس کو غلط طور پر محبت کی شادی کا خوبصورت نام دے دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اُصولاً شادی کا وہی طریقہ درست اور فطری طریقہ ہے جس کو عام طور پر طے کردہ شادی (arranged marriage) کہا جاتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے سلسلہ میں لڑکا اور لڑکی دونوں کی رضامندی معلوم کرنا ضروری ہے۔ یہ بھی اسلام میں ایک پسندیدہ بات ہے کہ دونوں فریق شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھیں اور بات کرکے پیشگی طور پر ایک دوسرے کا اندازہ کریں۔ خاندان کے لوگ اگر رشتہ طے کرتے ہوئے اسلام کی اس تعلیم کا لحاظ رکھیں تو اس میں وہ تمام فائدے اپنے آپ شامل ہو جائیں گے جن کو محبت کی شادی کا فائدہ بتایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نکاح کا طریقہ معتدل اور فطری بھی ہے اور اسی کے ساتھ محبت والی شادی کی خصوصیات بھی اُس کے اندر پوری طرح شامل ہیں۔

نقشۂ امتحان

عمر بن عبد العزیز ایک اموی خلیفہ تھے۔ ان کی پیدائش ٦١ ھ میں مدینہ میں ہوئی اور وفات حمص میں ١٠١ ھ میں ہوئی۔ وہ سلیمان بن عبد الملک کی ایک وصیت کے تحت خلیفہ مقرر ہوئے۔ ان کی متقیانہ زندگی اور ان کے عدل وانصاف کی بنا پر ان کو اسلام کی تاریخ میں پانچواں خلیفۂ راشد کہا جاتا ہے۔

عمر بن عبد العزیز بنوامیہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خلافت سے پہلے ان کی زندگی ایک امیرانہ زندگی تھی۔ مگر خلیفہ بننے کے بعد انھوں نے آرام وراحت کی زندگی کو چھوڑ دیا اور نہایت سادہ زندگی اختیار کرلی۔ ان کی بیوی فاطمہ بنت عبد الملک خود بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے پاس کافی زیور تھے جو شادی کے وقت ان کو اپنے میکہ کی طرف سے ملے تھے۔

عمر بن عبد العزیز نے خلیفہ ہونے کے بعد اپنی بیوی فاطمہ بنت عبد الملک سے کہا کہ تم اپنے تمام زیورات کو بیت المال میں داخل کردو ورنہ میں تم سے جدائی اختیار کرلوں گا۔ کیوں کہ مجھ کو یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ تم اور تمہارے زیورات اور میں تینوں ایک گھر میں رہیں۔ ان کی بیوی اس پر بخوشی راضی ہوگئیں اور اپنے تمام زیورات جن میں وہ قیمتی موتی بھی تھا جو عبد الملک نے اپنی بیٹی کو دیا تھا سب بیت المال میں بھجوادیا تاکہ وہ عوام کے مفاد کے لیے استعمال ہوں۔

فاطمہ بنت عبد الملک کا یہ واقعہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے فاطمہ بنت عبد الملک کو اس پر راضی کیا کہ وہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے مذکورہ غیر معمولی فیصلہ کو اتنی آسانی کے ساتھ قبول کرلیں۔ یہ سبب وہ مخصوص تصور حیات تھا جو اسلام ہر عورت اور مرد کو عطا کرتا ہے۔

اسلام کے تصور کے مطابق، موجودہ دنیا کی زندگی ایک عارضی زندگی ہے۔ یہ عارضی زندگی انسان کو امتحان کے لیے دی گئی ہے۔ انسان کی اصل زندگی موت کے بعد دوسری دنیا میں شروع ہوتی

ہے۔موجودہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور موت کے بعد کی دنیا عمل کا انجام پانے کی جگہ۔

موجودہ دنیا کی حیثیت سفر کی ہے اور اگلی دنیا کی حیثیت منزل کی۔ زندگی کا یہ تصور بے حد اہم ہے۔ وہ موجودہ دنیا کے معاملہ کو ثانوی چیز بنا دیتا ہے اور اگلی دنیا کے معاملہ کو اولین چیز۔ اس تصور کے تحت آدمی کا یہ ذہن بنتا ہے کہ موجودہ دنیا کا نقصان عارضی نقصان ہے۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ آدمی اگلی دنیا کے نقصان سے بچ جائے۔ یہ تصور کسی عورت یا مرد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آخرت کے انعام کی امید میں موجودہ دنیا کے کھونے کو برداشت کرلے۔

اس تصور کا تعلق جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات سے ہے اسی طرح اس کا تعلق عورت اور مرد کی شادی شدہ زندگی سے بھی ہے۔ شادی شدہ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے کی طرف سے کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آتا ہے۔ ایک کو دوسرے کی طرف سے کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ایک کی امیدیں دوسرے کے ساتھ پوری نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ صرف موجودہ دنیوی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہوں وہ ناخوش گوار تجربہ پیش آنے کے بعد برہم ہو جائیں گے، اس کے بعد وہ معتدل تعلقات کے قابل نہ رہیں گے۔ ان کی زندگی یا تو آہوں اور آنسوؤں میں گزرے گی یا وہ تعلقات کو توڑ کر تنہائی کی زندگی اختیار کرلیں گے۔ اور دونوں ہی صورتیں یکساں طور پر انسان کے لیے تباہ کن ہیں، عورت کے لیے بھی اور مرد کے لیے بھی۔

اسلام کے تصور حیات کے مطابق، موجودہ دنیا کی زندگی امتحان کی زندگی ہے۔ وہ ہر ایک کے لیے امتحان ہے خواہ وہ بظاہر اچھی حالت میں ہو یا بری حالت میں۔ اس دنیا میں خوشی کی حالت بھی ایک امتحان ہے اور غم کی حالت بھی ایک امتحان۔ یہاں آرام بھی امتحان ہے اور تکلیف بھی امتحان۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں زندگی کا ہر نقشہ امتحان کا نقشہ ہے۔ جس عورت یا مرد کو جو زندگی ملی ہے وہ اس کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ یہاں ہر ایک یکساں طور پر اپنا اپنا امتحان دے رہا ہے۔ گویا کہ موجودہ دنیا ایک بڑا امتحان ہال ہے۔ یہاں کسی عورت یا مرد کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ بظاہر اس دنیا میں زندگی کے بہت سے نقشے دکھائی دیتے ہیں مگر اپنی

حقیقت کے اعتبار سے ہر نقشہ ایک نقشۂ امتحان ہے۔ ہر ایک کو کسی نقشۂ امتحان میں رکھ کر اس کو جانچا جا رہا ہے۔

عورت یا مرد، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، ہر صورت میں ان کو طرح طرح کے احوال پیش آتے ہیں۔ ان احوال کے دوران ان کے اندر بار بار مختلف قسم کے منفی جذبات ابھرتے ہیں۔ کبھی ان کو کسی سے شکایت ہو جاتی ہے، کبھی ان کو کسی کے ہاتھوں نقصان اٹھانا پڑتا ہے، کبھی کسی کی بات پر ان کو غصہ آ جاتا ہے، کبھی کسی کے خلاف حسد کے جذبات ابھر جاتے ہیں۔ کبھی وہ چاہتے ہیں کہ وہ انتقام لیں، کبھی وہ غیر منصفانہ طور پر اپنا قبضہ قائم کرنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں، کبھی وہ کسی کا حق مارنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے حالات میں عورت اور مرد دونوں اپنی جائز حد سے باہر ہو جاتے ہیں۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر سب کچھ کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جب وہ کوئی چیز کھوتے ہیں تو اس کا کھونا ان کے لیے ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اسلام کا تصور حیات کسی عورت یا مرد کا سب سے بڑا مددگار ہے۔ اس تصور حیات کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ دنیا کے مادی فائدہ اور نقصان کو ثانوی چیز بنا دیتا ہے اور آخرت کے فائدہ اور نقصان کو اولین اہمیت کی چیز۔ اس طرح اسلام کا عقیدہ عورت یا مرد کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ہر نقصان کو گوارا کر کے اپنے آپ کو اعتدال کی حالت پر قائم رکھے۔ وہ ہر صدمہ کو وقتی چیز سمجھ کر اس کو نظر انداز کر دے۔

اسلام کا تصور حیات کسی عورت یا مرد کا یہ مزاج بناتا ہے کہ وہ نقصان کے بعد بھی عظیم فائدے کی امید رکھے۔ وہ دنیوی معاملہ سے محرومی کے باوجود یہ یقین رکھے کہ زیادہ بڑی چیز اب بھی آخرت کے انعام کی صورت میں اس کے پاس محفوظ ہے اور وہ اللہ کی رحمت سے اس کو مل کر رہے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ کامیاب ازدواجی زندگی بھی ایک نقشۂ امتحان ہے اور بظاہر ناکام ازدواجی زندگی بھی ایک نقشۂ امتحان۔ زندگی کے دونوں ہی نقشہ میں اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ عورت اور مرد منفی ردعمل سے اپنے آپ کو بچائیں اور اپنے آپ کو مثبت ردعمل پر قائم رکھیں۔ وہ ہر ناخوش گوار

بات کو وقتی سمجھ کر اُسے نظر انداز کر دیں۔ وہ ہر حال میں اپنی توجہ اگلی دنیا کی کامیابی پر لگائے رہیں۔ یہی کامیاب ازدواجی زندگی کا اُصول ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا اُصول موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں۔

قرآن کی سورہ نمبر ۸۹ میں ارشاد ہوا ہے:

پس انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے اور وہ اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اور وہ اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ (الفجر ۱۵۔۱۶)

قرآن کی اس آیت میں خدا کی تخلیقی اسکیم کو بتایا گیا ہے۔ اس اسکیم کے مطابق، انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ابتلا (آزمائش) ہے۔ یہاں اگر کسی مرد یا عورت کو مادی نعمت زیادہ ملتی ہے تو وہ اس کے لیے آزمائش کا ایک پرچہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت یا مرد کو مادی ساز و سامان کم دیا جاتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہوتا ہے۔ لیکن نادان لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ مادی فراوانی ہو تو وہ احساس برتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر مادی تنگی ہو تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ دونوں قسم کے ردعمل خدا کی اسکیم کے خلاف ہیں۔

سچے لوگ وہ ہیں جو دونوں حالتوں میں یکساں طور پر مطمئن رہیں۔ مادی فراوانی ان کو تواضع کے رویہ سے نہ ہٹائے اور مادی تنگی ان کو شکایت اور بددلی کی کیفیت میں مبتلا نہ کرے۔ دونوں حالتوں میں وہ یکساں طور پر مثبت نفسیات پر قائم رہیں۔ ایسی ہی مطمئن روحیں ہیں جو دنیا میں اعتدال کی روش پر قائم رہیں گی، اور یہی وہ روحیں ہیں جن کے لیے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

عائشہ صدیقہ

عائشہ بنت ابی بکر کو اسلام کی تاریخ میں خاتونِ اوّل (first lady) کا مقام حاصل ہے۔ وہ خلیفۂ اول ابوبکر صدیق کی صاحبزادی تھیں پھر وہ پیغمبر اسلام کی زوجۂ محترمہ بنیں۔ عائشہ صدیقہ قرآن کی ایک بڑی عالمہ تھیں۔ علم حدیث میں ان کو مجتہدانہ حیثیت حاصل تھی۔

عائشہ صدیقہ کے والد ابوبکر بن قحافہ تھے اور اُن کی والدہ کا نام ام رومان بنت عامر تھا۔ وہ مکّہ میں نبوت کے پانچویں سال پیدا ہوئیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ میں مختلف روایتوں کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ اُن کی تاریخ پیدائش غالبًا شوال ۹ قبل ہجرت مطابق جولائی ۶۱۴ء ہے۔
سیرت عائشہ، سید سلیمان ندوی، مطبوعہ شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، صفحہ ۱۹

عائشہ صدیقہ کا حافظہ بہت غیر معمولی تھا۔ اُن کو اپنے بچپن کے زمانہ تک کی اکثر باتیں یاد تھیں۔ عرب شعراء کا کلام اُن کو اتنا زیادہ یاد تھا کہ اکثر معاملات میں وہ کوئی نہ کوئی شعر پڑھ دیا کرتی تھیں۔ اپنے اہل خاندان کے ساتھ نبوت کے تیرہویں سال پیغمبر اسلام نے ابوبکر صدیق کے ساتھ ہجرت فرمائی۔ عائشہ صدیقہ بھی اپنے اہل خاندان کے ساتھ مکہ سے مدینہ آ گئیں۔ قوت حافظہ کے ساتھ ساتھ وہ غیر معمولی طور پر اخّاذ تھیں۔ ہجرت کے وقت اُن کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ لیکن اس کم عمری میں اُن کی قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ ہجرت نبوی کے تمام واقعات بلکہ تمام جزئی باتیں اُن کو یاد تھیں۔ اُن سے بڑھ کر کسی صحابی نے ہجرت کے واقعات کا مسلسل بیان محفوظ نہیں رکھا ہے۔ عائشہ صدیقہ کے بارہ میں پیغمبر اسلام نے فرمایا: **فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام** (عائشہ کی فضیلت دوسری تمام عورتوں پر ویسی ہی ہے جیسے کہ ثرید کی فضیلت دوسرے کھانوں پر)

صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا

پیغمبر اسلام کا پہلا نکاح مکّہ میں خدیجہ بنت خویلد سے ہوا جب کہ آپ کی عمر ۲۵ سال تھی۔

ہجرت سے تین سال پہلے خدیجہ کی وفات ہوگئی۔ اُس کے بعد آپ کا دوسرا نکاح عائشہ بنت ابی بکر سے ہوا۔ اس نکاح میں پیغام رسانی کا کام خولہ بنت حکیم نے کیا تھا۔ حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عائشہ صدیقہ کا نکاح پیغمبر اسلام کے ساتھ مکّہ میں ہوا۔ اُس وقت عائشہ صدیقہ کی عمر ۶ سال تھی۔ آپ کی رخصتی ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوئی۔ اُس وقت آپ کی عمر نو سال ہوچکی تھی۔

جامع الاصول فی احادیث الرسول، ابن الاثیر الجزری، مطبوعه قاهره ۱۹۷۲، جلد ۱۱ صفحہ ۴۰۴

عائشہ صدیقہ کا نکاح خود اُن کے والد ابوبکر صدیق نے پڑھایا۔ روایات کے مطابق، آپ کی مہر پانچ سو درہم تھی (مسند الامام احمد بن حنبل، مسند عائشہ)۔ قدیم زمانہ میں عرب میں تعلیم کا رواج نہ تھا۔ بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس قلیل تعداد میں ایک نام ابوبکر صدیق کا تھا۔ اس خاندانی روایت کی بنا پر عائشہ صدیقہ کو بھی یہ موقع ملا کہ وہ لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیں۔ چنانچہ وہ قرآن کو دیکھ کر پڑھتی تھیں۔ بعض روایات کے مطابق، ان کو لکھنا بھی آتا تھا۔ چنانچہ وہ خط کا جواب تحریری شکل میں دے سکتی تھیں۔

تعلیم وتربیت

عائشہ صدیقہ کے حالات میں بتایا گیا ہے کہ وہ علمی اعتبار سے صحابہ کے درمیان ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مسلم خواتین میں سب سے بڑی فقیہہ تھیں اور دین وادب میں وہ اُن سب سے زیادہ علم رکھتی تھیں **(کانت افقه نساء المسلمین و اعلمهن بالدین و الأدب)**

الاعلام، خیر الدین الزرکلی، جلد ۳ صفحہ ۲۴۰

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: **کانت عائشه افقه الناس و اعلم الناس و أحسن الناس رأیا فی العامة** (عائشہ لوگوں میں سب سے زیادہ فقیہہ، سب سے زیادہ صاحب علم اور عوام میں سب سے اچھی رائے والی خاتون تھیں) مستدرک حاکم۔

ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں: **ما اشکل علینا اصحاب محمد ﷺ حدیث قط فسألنا عائشة الا وجدنا عندها منه علماً** (اصحاب رسول کو جب بھی کسی مسئلہ میں کوئی اشکال ہوتا تو ہم

عائشہ سے اُس کی بابت پوچھتے اور اُن کے پاس ہم اُس کے بارہ میں کوئی علم پالیتے۔

الجامع للترمذی، کتاب مناقب عائشہ

عائشہ صدیقہ کے علم کے بارہ میں اس طرح کی باتیں حدیث وسیر کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اُن سے ایک اہم مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اسلام میں خواتین کی تعلیم کی اہمیت کا مسئلہ ہے۔ عائشہ صدیقہ کو یہ علم پیدائشی طور پر نہیں ملا تھا اور نہ مِل سکتا تھا۔ یقینی طور پر اُن کو یہ علم اُس وقت اسلامی معاشرہ میں حاصل ہوا۔

عائشہ صدیقہ کے والد ابوبکر صدیق قدیم عرب کے اُن ڈیڑھ درجن افراد میں شمار کیے جاتے تھے جولکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ چنانچہ عائشہ صدیقہ کا پہلا تعلیمی ادارہ خود ان کا گھر بنا۔ اپنے والد سے اُنھوں نے حکیمانہ اشعار اور عرب خطباء کے کلام کو سنا اور ان کو حفظ کرلیا۔ اسی طرح اُنھوں نے اپنے والد سے علم الأنساب سیکھا جو گویا عرب تاریخ کا علم حاصل کرنے کے ہم معنیٰ تھا۔ نکاح کے بعد جب وہ پیغمبر اسلام کی صحبت میں آئیں تو اُن کو یہ موقع ملا کہ وہ پیغمبر جیسے معلّم سے علم حاصل کریں۔ چنانچہ یہ سلسلہ ہر دن کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا تھا۔ اس ''حلقۂ درس'' کی مثالیں کثرت سے حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ عائشہ صدیقہ کی رہائش گاہ جو ایک حجرہ پر مشتمل تھی وہ قدیم مسجد نبوی سے بالکل متصل واقع تھی۔ پیغمبر اسلام کی تعلیمی مجلسیں جو ہر روز مسجد میں جاری رہتی تھیں وہ اپنے حجرہ میں رہتے ہوئے ان کو سنا کرتی تھیں۔

دینی علوم کی تعلیم کا کوئی وقت مخصوص نہ تھا۔ پیغمبر اسلام کی صحبت شب وروز اُن کو حاصل تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے حلقے روزانہ مسجد نبوی میں منعقد ہوتے تھے۔ عائشہ صدیقہ کا حجرہ اس سے بالکل قریب تھا۔ اس بنا پر آپ گھر سے باہر بھی لوگوں کو جو درس دیتے تھے، وہ اس میں شریک رہتی تھیں۔ اگر کبھی دوری کی وجہ سے کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حجرہ میں آتے تو وہ اس کو دریافت کرلیتیں۔ کبھی اُٹھ کر مسجد کے قریب چلی جاتیں۔ اس کے علاوہ آپ نے

عورتوں کی درخواست پر ہفتہ میں ایک خاص دن ان کی تعلیم وتلقین کے لیے متعین فرمادیا تھا۔

اس طرح کے حوالے جو عائشہ صدیقہ کی نسبت سے حدیث وسیر کی کتابوں میں آئے ہیں، وہ صرف خاتونِ اول کی سیرت کو نہیں بتاتے بلکہ خود اسلامی معاشرہ کی ایک خصوصیت کو بتاتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ نہ صرف مردوں کے لیے بلکہ عورتوں کے لیے بھی ایک وسیع تر تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس معاشرہ میں خواتین کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اُن کو اپنے علمی شوق کی تکمیل کے مواقع دیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خاتون اپنی محنت کے ذریعہ علم میں مردوں سے بھی آگے بڑھ جائے، جیسا کہ عائشہ صدیقہ کے ساتھ پیش آیا۔

تعلیم وتربیت کے معاملہ میں عائشہ صدیقہ کی حیثیت ایک منفرد یا استثنائی شخصیت کی نہیں ہے بلکہ وہ اس معاملہ میں ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علم کے میدان میں ان کی سبقت مسلم خواتین کے لیے ایک رہنما مثال ہے۔

پیغمبر سے براہ راست دینی تربیت حاصل کرنے کا موقع جتنا زیادہ عائشہ صدیقہ کو ملا، شاید کسی مرد یا عورت کو نہیں ملا۔ مزید یہ کہ عائشہ صدیقہ اُس وقت اپنی ابتدائی عمر میں تھیں۔ اس لیے وہ اُس ذہنی مسئلہ سے مکمل طور پر محفوظ تھیں جس کو نفسیات کی اصطلاح میں کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ عمر کے لحاظ سے وہ اس پوزیشن میں تھیں کہ وہ ہر بات کو بے آمیز ذہن سے سنیں اور وہ فوراً اُن کے ذہن کا جزء بن جائے۔ اسی کے ساتھ عائشہ نہایت ذہین اور اخّاذ طبیعت کی مالک تھیں۔ اس لیے وہ پیغمبر کی ہر بات کو اُس کی پوری گہرائی کے ساتھ سمجھ لیتیں۔ پیغمبر اگر چہ ہمیشہ جوامع الکلم کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے مگر وہ اپنی غیر معمولی قوت استنباط کی بنا پر اُس کو اُس کے تمام تفصیلی پہلوؤں کے ساتھ سمجھ لیتی تھیں اور اس کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتی تھیں۔

عائشہ صدیقہ کو پیغمبر اسلام سے استفادہ کا جو خصوصی موقع ملا اُسی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ دین کی فہم و بصیرت میں اتنی ممتاز بن گئیں کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد بڑے بڑے صحابہ اُن سے رجوع کرتے اور اُن کے ذریعہ حکمتِ نبوت کی تعلیم حاصل کرتے۔

شخصیت کی تعمیر

عائشہ صدیقہ اسلام کی تاریخ میں ایک استثنائی شخصیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ شخصیت کیسے بنی اس کی تفصیلات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ عائشہ صدیقہ قرآن کا مسلسل مطالعہ کرتی رہتی تھیں۔ اُن کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ مزید یہ کہ اُن کے لیے حصولِ علم کا سب سے بڑا ذریعہ براہِ راست پیغمبر اسلام سے استفادہ تھا۔ اس استفادہ کا سلسلہ مختلف صورتوں میں برابر جاری رہتا تھا، دن کے اوقات کے علاوہ رات کے لمحات میں بھی۔

اس معاملہ کی ایک مثال اس روایت میں ملتی ہے جس میں عائشہ صدیقہ خود بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر سے پہلے کی دو رکعت نماز پڑھتے۔ اُس وقت اگر میں بیدار ہوتی تو وہ مجھ سے بات کرتے ورنہ آپ لیٹ جاتے (**كان النبي صلى الله عليه وسلم اذا صلى ركعتي الفجر فان كنت مستيقظة حدّثني والاّ اضطجع**۔

صحیح مسلم، بحوالہ مشکاۃ المصابیح، جلد ۱، صفحہ ۳۷۳، رقم الحدیث ۱۱۸۹

اس روایت میں عائشہ صدیقہ نے حدثنی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام مجھ سے گفتگو کرتے تھے۔ یہ گفتگو یقینی طور پر دینی اور علمی موضوعات پر ہوتی تھی، عائشہ صدیقہ خود بھی اس کی ایک حصہ دار ہوتی تھیں۔ گویا یہ ایک قسم کا فکری تبادلہ (intellectual exchange) ہوتا تھا۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ عائشہ صدیقہ کے اندر ذہنی ارتقاء کا عمل (process) مسلسل طور پر جاری رہے۔ یہاں تک کہ ان کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا ہو جائے جس کے تحت وہ اسلام کی تاریخ میں اُس رول کو ادا کر سکیں جو انہوں نے پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد نصف صدی تک ادا کیا۔ رات کی تنہائی کے اس قیمتی وقت کو پیغمبر اسلام اس طرح استعمال فرماتے کہ آپ عائشہ صدیقہ کی فکری اور روحانی تربیت کرتے۔ یعنی وہی چیز جس کو قرآن میں تزکیہ اور تعلیم حکمت بتایا گیا ہے۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے یہاں حدیث اور سیرت کی کتابوں سے کچھ مزید

حوالے نقل کیے جاتے ہیں۔ان سے اندازہ ہوگا کہ زمانۂ نبوت میں عائشہ صدیقہ کی شخصیت کس طرح تعمیر ہوئی۔

عائشہ صدیقہ کا تبادلۂ خیال پیغمبراسلام سے کس طرح ہوتا تھا،اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بار پیغمبراسلام نے فرمایا کہ:**من حوسب عذب** (جس کا حساب لیا گیا وہ عذاب میں مبتلا ہوا) عائشہ صدیقہ نے اس سلسلہ میں سوال کیا کہ اے خدا کے رسول، خدا نے قرآن میں اس کے بجائے یہ فرمایا ہے کہ **فسوف یحاسب حسابا یسیرا** (الانشقاق ۸) یعنی آپ مطلق طور پر فرمارہے ہیں کہ حساب کے بعد آدمی بچ نہیں سکتا۔ حالاں کہ قرآن کے بیان کے مطابق، حساب کے بعد بھی آدمی عذاب سے بچ سکتا ہے۔پیغمبراسلام نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ اعمال میں پیشی کی بات ہے۔ لیکن جس کے اعمال میں جرح وقدح شروع ہوئی تو وہ ہلاک ہوا۔اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبراسلام سے استفادہ میں عائشہ کی حیثیت محض سامع کی نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ وہی چیز تھی جس کو تبادلۂ خیال کہا جاسکتا ہے۔

اسی طرح عائشہ صدیقہ نے ایک موقع پر پیغمبراسلام سے یہ سوال کیا کہ مشرکین نے اگر کوئی نیک کام کیا ہے تو اس کی جزا اُن کو ملے گی یا نہیں۔اس سلسلہ میں عائشہ صدیقہ نے عبداللہ بن جدعان کی مثال دی۔وہ مشرک تھا اور شرک کی حالت ہی میں اُس کا انتقال ہوا۔مگر وہ ایک اعلیٰ اخلاق کا آدمی تھا۔وہ لوگوں کی مدد کیا کرتا تھا۔عائشہ صدیقہ نے سوال کیا کہ کیا عبداللہ بن جدعان کا یہ اخلاقی عمل اُس کو آخرت میں فائدہ دے گا۔پیغمبراسلام نے فرمایا کہ نہیں۔کیوں کہ اُس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ: **رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین** (اے میرے رب، جزا کے دن تو میرے گناہوں کو معاف فرما)۔
صحیح مسلم، کتاب النکاح

اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ پیغمبراسلام نے ایک بار یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ ایک ماہ تک اپنی ازواج سے الگ رہیں گے۔اس کو تاریخ میں ایلاء کا واقعہ کہا جاتا ہے۔یہ اعلان کرکے آپ ایک قریبی مکان کی چھت پر چلے گئے۔ایلاء کا یہ معاملہ ہجری مہینہ کی یکم تاریخ کو شروع ہوا۔۲۹ دن پورا ہونے کے بعد آپ

چھت سے اُترے۔ جب آپ عائشہ صدیقہ کے حجرہ میں آئے تو اُنھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ نے تو ایک مہینہ تک الگ رہنے کو کہا تھا اور ابھی مہینہ کے تیس دن پورا ہونے میں ایک روز باقی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے اور جبرئیل نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ آج چاند ہوگیا۔

صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلوۃ فی السطوح و المنبر و الخشب۔

عائشہ صدیقہ کے مذکورہ سوال و جواب سے ایک مزید دینی مسئلہ معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق رویتِ ہلال سے ہے۔ اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ نئے چاند کے معاملہ میں اگر عینی مشاہدہ نہ ہوا ہو، تاہم قابلِ اعتماد خبر سے ۲۹ تاریخ کو معلوم ہو جائے کہ چاند ہوگیا ہے تو اُس کو تسلیم کر لیا جائے گا اور اُس کی بنیاد پر عبادت کا نظام قائم کیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں بالواسطہ رویت کی اہمیت بھی اُتنی ہی ہے جتنی کہ براہ راست رویت کی اہمیت۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے رسول اللہ کے پاس آنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ آنے دو، وہ اپنے خاندان میں بُرا ہے۔ جب وہ آکر بیٹھا تو آپ نے اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کی۔ عائشہ صدیقہ کو تعجب ہوا۔ جب وہ چلا گیا تو عائشہ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول، آپ تو اس کو اچھا نہیں جانتے تھے، لیکن جب وہ آیا تو آپ نے اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ، سب سے بُرا آدمی وہ ہے جس کی بداخلاقی سے ڈر کر لوگ اُس سے ملنا چھوڑ دیں۔

صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما یجوز من اغتیاب اہل الفسا د والرّ یب

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ اعتدال کے ساتھ کام کرو۔ لوگوں کو اپنے نزدیک کرو اور خوش خبری سُناؤ کہ لوگوں کا عمل اُن کو جنت میں نہ لے جائے گا۔ عائشہ صدیقہ کو یہ آخری بات عجیب معلوم ہوئی۔ وہ سمجھیں کہ جو لوگ معصوم ہیں وہ تو اس سے مستثنٰی ہوں گے۔ پوچھا کہ یا رسول اللہ، کیا آپ کو بھی نہیں۔ فرمایا کہ نہیں، لیکن یہ کہ خدا اپنی مغفرت اور رحمت سے مجھے ڈھانک لے۔

صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل

ایک بار رسول اللہ ﷺ کے پاس چند یہودی آئے۔ انھوں نے السلام علیک (تم پر سلامتی ہو)

کے بجائے زبان دبا کر **السّــام عـلیک** (تم کو موت آئے) کہا۔ عائشہ سُن رہی تھیں۔ وہ ضبط نہ کر سکیں اور بولیں۔ **علیکم السّام و اللعنة** (تم پر موت اور لعنت) پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ تم کو نرمی اختیار کرنا چاہیے۔ خدا ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔

صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الرفق فی الأمر کلہ۔

ایک روایت کے مطابق، عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ ایک مجلس میں صفیہ (زوجۂ رسول) کا ذکر ہوا۔ صفیہ کسی قدر پستہ قد تھیں۔ عائشہ صدیقہ نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ صفیہ تو بس اتنی ہیں (یعنی وہ پستہ قد ہیں)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ایسی بات کہی کہ اگر وہ سمندر میں ڈال دی جائے تو سمندر کا پانی بھی آلودہ ہو جائے۔

مسند احمد، جلد ۶ صفحہ ۱۸۹، دار الفکر، ۱۹۷۸

اسی طرح کی ایک اور روایت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے جس میں پیغمبر اسلام ﷺ نے عائشہ صدیقہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: **ایاك و محقرات الذنوب** (تم چھوٹے گناہوں سے بچو) ان دونوں روایتوں سے ایک نہایت اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کو اُن گناہوں سے بھی بچنے کا شدید اہتمام کرنا چاہیے جن کو لوگ معمولی سمجھتے ہیں اور بار بار اُس میں ملوث ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح کی عادت عورت یا مرد کو گناہوں کے بارہ میں غیر حساس بنا دیتی ہے۔ اور جو عورت یا مرد چھوٹے گناہ کے بارہ میں حساسیت کھو دے وہ آسانی سے بڑے گناہ میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

ایک موقع پر آپ نے دعا مانگی۔ خداوندا، مجھے مسکین زندہ رکھ اور حالتِ مسکینی ہی میں موت دے، اور مسکینوں کے ساتھ قیامت میں اُٹھا۔ عائشہ صدیقہ نے عرض کیا کہ یہ کیوں، یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کہ مسکین، دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ اے عائشہ، تم کسی کو خالی ہاتھ واپس نہ کرنا، اگرچہ وہ چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ مسکینوں سے محبت رکھو اور اُن کو اپنے پاس جگہ دیا کرو۔

الجامع للترمذی، ابواب الزہد

مذکورہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور عائشہ صدیقہ کے درمیان صحبت کا جو تعلق تھا وہ سادہ طور پر متکلم اور سامع کا تعلق نہ تھا۔ بلکہ وہ دوطرفہ گفتگو اور تبادلۂ خیال کا تعلق تھا۔ یہ گویا ایک قسم کا مذاکرہ تھا۔ اس مذاکرہ کے دوران باتوں کی وضاحت ہوتی تھی۔ سوال وجواب کی صورت میں معاملہ کے مختلف گوشے واضح ہوتے تھے۔

قرآن میں رسول کے چار کام بتائے گئے ہیں جن میں سے ایک تزکیہ (آل عمران ۱۶۴) ہے۔ تزکیہ سے مراد کوئی پُراسرار (mysterious) چیز نہیں۔ وہ ایک معلوم چیز ہے۔ اس سے وہی چیز مراد ہے جس کو ذہنی ارتقاء (intellectual development) کہا جاتا ہے۔ ذہنی ارتقاء ہی کے ایک نتیجہ کا نام روحانی ارتقاء ہے۔ عائشہ صدیقہ کو یہ تمام فکری اور روحانی فائدے پیغمبر اسلام سے مسلسل استفادہ کے ذریعہ حاصل ہوئے۔

استنباطاتِ عائشہ

عائشہ صدیقہ سے حدیث کی مختلف کتابوں میں جو روایتیں منقول ہیں اُن کی کُل تعداد ۲۲۱۰ ہے۔ تعداد روایت کے اعتبار سے بعض دوسرے صحابی اُن سے آگے ہیں۔ مثلاً ابوہریرہ کی روایتوں کی تعداد ۵۳۶۴ ہے۔ عبد اللہ بن عمر کی روایتوں کی تعداد ۲۶۳۰ ہے۔ انس بن مالک کی روایتوں کی تعداد ۲۲۸۶ ہے۔ مگر ایک معاملہ میں عائشہ صدیقہ کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اور وہ ہے، حدیثوں کی تشریح اور اُن سے مسائل کا استنباط۔ عائشہ صدیقہ کو یہ امتیاز اس لیے حاصل ہوا کہ وہ پیغمبر اسلام سے قریبی صحبت کی بنا پر پیغمبر اسلام کے مزاج کے بارہ میں زیادہ گہری واقفیت رکھتی تھیں۔ یہاں اس سلسلہ میں کچھ مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ صحیح البخاری میں عائشہ صدیقہ کی ایک تفصیلی روایت آئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: قرآن میں سب سے پہلے جو سورتیں نازل ہوئیں وہ مفصل کی سورتیں ہیں جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تو پھر حلال وحرام کے احکام اُترے۔ اگر پہلے ہی یہ اُترتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہتے کہ ہم شراب ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر یہ اُترتا کہ زنانہ

کروتو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنانہ چھوڑیں گے۔ مکہ میں جب میں کھیلتی تھی تو قرآن کی یہ آیت اُتری۔ اُن کے وعدہ کا وقت قیامت ہے اور قیامت نہایت سخت اور نہایت تلخ چیز ہے۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء جب اتری تو میں آپ کے پاس تھی۔

صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، رقم الحدیث ۴۹۹۳

عائشہ صدیقہ نے اپنی اس روایت میں جو بات کہی وہ انہی لفظوں میں قرآن وحدیث میں موجود نہیں۔ مگر پیغمبر اسلام کی مسلسل صحبت کے ذریعہ اُنہیں یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ قرآن کے احکام کے نزول میں تدریج کا اُصول رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن پر مبنی سماج بنانے کے عمل کا آغاز حدود اور قانون کے احکام کے نفاذ سے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اُس کا صحیح آغاز یہ ہے کہ پہلے انسان کی سوچ بدلی جائے۔ انسان کے اندر احکام کی قبولیت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ یعنی فکری انقلاب کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ عملی احکام کو کسی سماج میں نافذ کیا جائے—— عائشہ صدیقہ کو یہ اہم حقیقت یقینی طور پر پیغمبر اسلام سے طویل مذاکرہ کے ذریعہ معلوم ہوئی۔

۲۔ عائشہ صدیقہ کی ایک روایت اس طرح آئی ہے: مدینہ کی جنگ بُعاث وہ واقعہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے لیے پہلے سے طے کردیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ آئے تو اُس وقت اہل مدینہ کی جمعیت منتشر ہوگئی تھی۔ اُن کے سردار باہمی جنگ میں مارے جاچکے تھے۔ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی خاطر اُن کے اسلام میں داخل ہونے کے لیے یہ واقعہ پہلے ہی سے مہیّا کردیا تھا۔

صحیح البخاری، کتاب مناقب الانصار، باب القسامۃ فی الجاہلیۃ۔

مکہ کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی سخت مخالفت کی۔ جب کہ اُس سے تین سو میل دور واقع مدینہ میں آپ کا پیغام کسی مزاحمت کے بغیر پھیل گیا۔ یہ فرق کیوں تھا۔ اس کا جواب عائشہ صدیقہ کی مذکورہ روایت میں ملتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، مکہ اور مدینہ کے اس فرق کا معاملہ قرآن یا حدیث رسول میں مذکور نہیں۔ پھر عائشہ صدیقہ کو یہ اہم حقیقت کیسے معلوم ہوئی۔ اُس کا ذریعہ صحبت رسول تھا۔ رسول اللہ اپنی گفتگوؤں

میں اس سلسلہ میں جو باتیں کہتے تھے اُس سے عائشہ صدیقہ نے اس حقیقت کو اخذ کیا اور پھر اُس کو ساری امت کو بتایا۔

عائشہ صدیقہ کی اس روایت کے مطابق، اصل بات یہ تھی کہ مکہ کے برعکس، مدینہ میں وہ بڑے قبائلی سردار موجود ہی نہ تھے جو اس قسم کی مزاحمت کا اصل سبب ہوتے ہیں۔ رسول اللہ کی نبوت سے کچھ ہی پہلے وہاں خانہ جنگی ہوئی جس میں مدینہ کے اکثر بڑے سردار قتل ہوگئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کسی مشن کے خلاف مزاحمت کی تحریکیں ہمیشہ لیڈر لوگ چلاتے ہیں۔ پھر جب مدینہ میں وہاں کے لیڈر لوگ نہ رہے تو مزاحمت کی جڑ اپنے آپ کٹ گئی۔ چنانچہ عوام نے اسلام کو اپنی فطرت کی آواز سمجھ کر اس کو قبول کرلیا۔

۳۔ صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں عائشہ صدیقہ کے شاگرد ابن ابی ملیکہ نے اُن سے پوچھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود کسی کو خلیفہ بناتے تو کس کو بناتے۔ فرمایا ابوبکر کو۔ پوچھا اُن کے بعد، جواب دیا عمر کو۔ سوال کیا کہ پھر، کہا ابوعبیدہ بن جرّاح کو۔ اس کے بعد کس کو۔ اس کے جواب میں عائشہ صدیقہ چپ ہوگئیں۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل ابی بکر۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عائشہ صدیقہ نے پیغمبر اسلام کی صحبت سے جو باتیں سیکھی تھیں اُن میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ اجتماعی معاملات میں فرد کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ اجتماعی زندگی کی تعمیر صرف نظام یا سسٹم کے ذریعہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کے لیے ہمیشہ ایک فرد درکار ہوتا ہے، ایک ایسا فرد جو خصوصی صلاحیتوں کا حامل ہو۔ عائشہ صدیقہ کے مطابق، اسلام کے دور اوّل کے انقلاب میں بھی صرف تین آدمی ایسے تھے جو کامیابی کے ساتھ اجتماعی ذمہ داری کو سنبھال سکیں۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اجتماعی اصلاح کے معاملہ میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک ڈھانچہ کو توڑ کر دوسرا ڈھانچہ بنایا جائے۔ بلکہ اجتماعی اصلاح کی اصل ضرورت یہ ہے کہ اُس کے لیے اہل افراد تیار کیے جائیں۔ یہ سیاسی حکمت (political wisdom) جو عائشہ صدیقہ کے

ذریعہ امت کو معلوم ہوئی وہ غالباً کسی اور کے ذریعہ معلوم نہ ہوسکی۔

۴۔ عائشہ صدیقہ کی ایک روایت یہ ہے کہ بڑا گنہگار وہ شاعر ہے جو تمام قبیلہ کی ہجو کرے۔ یعنی صرف ایک دو شخص کی برائی کے سبب سے پورے قبیلہ کو بُرا کہہ دینا ایک عظیم اخلاقی بُرائی ہے۔

البخاری، الأدب المفرد، کتاب الشعر۔

عائشہ صدیقہ کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تنقید میں جنرلائیزیشن نہایت بُری چیز ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم یا قبیلہ کے ایک فرد کی کوئی بُرائی سامنے آئے تو لوگ اس کو لے کر پوری قوم یا قبیلہ کو بُرا بتانے لگتے ہیں۔ یہ طریقہ اخلاقی نقطۂ نظر سے غیر ذمہ دارانہ اور اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز ہے۔ زندگی کا یہ گہرا اُصول بھی اتنے واضح انداز میں غالباً صرف عائشہ کے ذریعہ بیان ہوسکا۔

۵۔ ابوسلمہ تابعی کہتے ہیں کہ اُن کے اور کچھ لوگوں کے درمیان (زمین کے بارہ میں) ایک نزاع تھی۔ اس کا ذکر اُنہوں نے عائشہ صدیقہ سے کیا تو اُنہوں نے کہا کہ اے ابوسلمہ، تم اس زمین کو چھوڑ دو۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بالشت بھر زمین کے لیے بھی اگر کوئی ظلم کرے گا تو ساتوں طبقے اُس کے گلے میں ڈالے جائیں گے (**ان ابا سلمة حدثه انه كانت بينه و بين أناس خصومة فذكر لعائشة رضى الله عنها فقالت: يا أباسلمة اجتنب الأرض فان النبى ﷺ قال: من ظلم قيد شبر من الأرض طوقّه من سبع أرضين**)

صحیح البخاری، کتاب المظالم، **باب اثم من ظلم شيئا من الأرض** (رقم الحدیث ۲۴۵۳)

عائشہ صدیقہ کی اس روایت سے ایک اہم اجتماعی مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دو شخص یا دو گروہ کے درمیان مادّی نزاع پیدا ہو اور دو طرفہ بنیاد پر وہ مسئلہ حل نہ ہو رہا ہو، ایسی صورت میں دونوں فریقوں میں سے بہتر فریق وہ ہے جو معاملہ کو اللہ پر ڈالتے ہوئے یک طرفہ طور پر اس کو ختم کرلے۔ اجتماعی امن کے قیام کا بلاشبہہ یہ سب سے زیادہ اہم اُصول ہے۔

۶۔ ابن ابی السائب تابعی مدینہ کے ایک واعظ تھے۔ وہ مسجّع دعائیں بنا کر پڑھا کرتے اور وہ

ہر وقت لوگوں کے سامنے وعظ کے لیے آمادہ رہتے۔ عائشہ صدیقہ نے اُن سے خطاب کر کے کہا کہ تم مجھ سے تین باتوں کا عہد کرو، ورنہ میں بزور تم سے باز پرس کروں گی۔ اُنھوں نے کہا کہ اے ام المؤمنین، وہ کیا باتیں ہیں۔ عائشہ صدیقہ نے کہا کہ دعاؤں میں عبارتیں مسجّع نہ کرو کیوں کہ آپ کے اصحاب ایسا نہیں کرتے تھے۔ ہفتہ میں صرف ایک دن وعظ کہا کرو۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو دو دن اور اس سے بھی زیادہ چاہو تو تین دن۔ لوگوں کو خدا کی کتاب سے اُکتا نہ دو۔ ایسا نہ کیا کرو کہ لوگ جہاں بیٹھے ہیں وہاں آ کر بیٹھ جاؤ اور بات کاٹ کر اپنا وعظ شروع کر دو۔ بلکہ جب ان کی خواہش ہو اور وہ درخواست کریں، تب کہو۔

مسند احمد، جلد ۶، صفحہ ۲۱۷

عائشہ صدیقہ کی اس روایت سے دین کی اصل روح معلوم ہوتی ہے۔ دین کی اصل روح کے مطابق، دعا قلبی جذبات کا مخلصانہ اظہار ہے جب کہ مسجّع دعا میں تصنع اور منافقت کا انداز شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وعظ نصیحت کا ایک کلمہ ہے اور خیر خواہانہ نصیحت میں ہمیشہ مدعو کی رعایت شامل رہتی ہے۔ اسی طرح یہ کہ مومن کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی بات کو غور سے سنے اور جو بات کہے اس میں لوگوں کے مزاج کی رعایت ہو۔

۷۔ ایک شخص نے عائشہ صدیقہ سے سوال کیا۔ اُس نے کہا کہ اے ام المؤمنین، بعض لوگ ایک رات میں قرآن دو دو، تین تین بار پڑھتے ہیں۔ عائشہ صدیقہ نے کہا کہ اُنھوں نے پڑھا مگر اُنھوں نے نہیں پڑھا (اولٰئك قرؤا ولم يقرؤا) رسول اللہ ﷺ تمام رات نماز میں کھڑے رہتے تھے۔ لیکن سورۂ بقرہ، آل عمران اور سورۂ نسا سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ آپ جب کسی بشارت کی آیت پر پہنچتے تو خدا سے دعا مانگتے اور جب کسی وعید کی آیت پر پہنچتے تو پناہ مانگتے۔ مسند احمد، جلد ۶، صفحہ ۹۲۔

اس روایت سے دو چیزوں کے بارہ میں دین کی روح معلوم ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کی تلاوت کیسے کی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ نفل نماز کی اصل صورت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ دونوں کام عام طور پر اپنے حجرے میں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اس اہم حقیقت کا علم بقیہ دنیا کو صرف آپ کی

رفیقۂ حیات کے ذریعہ ہوسکتا تھا۔ عائشہ صدیقہ نے امت کے لیے یہی کام انجام دیا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تلاوت کے سلسلہ میں اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ تدبر ہے، نہ کہ وہ چیز جس کو عام طور پر ختم قرآن کہا جاتا ہے۔

۸۔ کعبہ پر جب نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے اور پُرانا غلاف اُتارلیا جاتا ہے تو یہ سوال ہوتا ہے کہ پُرانے غلاف کو کیا کیا جائے۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ تعظیم اور ادب کے نقطۂ نظر سے پُرانے غلاف کو زمین میں دفن کردیا جاتا تھا۔ شیبہ بن عثمان نے جو اس زمانہ میں کعبہ کے کلید بردار تھے، عائشہ صدیقہ سے بیان کیا کہ ہم سارے غلاف کو اکھٹا کر کے ایک گہرا کنواں کھود کر اُس میں دفن کردیتے ہیں۔ تاکہ ناپا کی کی حالت میں لوگ اس کو پہن نہ لیں۔ عائشہ صدیقہ نے شیبہ سے کہا کہ یہ تو اچھی بات نہیں۔ تم برا کرتے ہو۔ جب وہ غلاف کعبہ پر سے اُتر گیا تو وہ عام کپڑا ہے۔ اب اگر کسی نے ناپا کی کی حالت میں اُس کو پہن بھی لیا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تم کو چاہیے کہ اس کو بیچ دیا کرو اور اس کے جو دام آئیں وہ غریبوں اور مسافروں کو دے دیا کرو۔ عائشہ صدیقہ نے اپنی بصیرت سے یہ سمجھا کہ یہ تعظیم غیر شرعی ہے جس کا خدا اور اس کے رسول نے حکم نہیں دیا۔

عین الاصابۃ سیوطی، بحوالہ سنن بیہقی۔

عائشہ صدیقہ کی یہ بات دین کی اصل روح کے عین مطابق ہے۔ مگر یہ ایک ایسی نازک بات ہے کہ جس کو کہنے کی جرأت ایک عام مسلمان نہیں کرسکتا۔ عائشہ صدیقہ کو پیغمبر اسلام کی مسلسل صحبت کے ذریعہ دین کا جو فہم صحیح ملا تھا اُس نے اُن کے اندر یہ ہمّت پیدا کی کہ وہ یقین کے ساتھ اس بات کا اعلان کرسکیں۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں عائشہ صدیقہ سے حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ عائشہ صدیقہ کی اس قسم کی روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ عائشہ صدیقہ کا ابتدائی عمر میں رسول اللہ کی صحبت اور رفاقت میں آنا دینی نقطۂ نظر سے کتنا اہم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دین کی بہت سی گہری حکمتیں بعد کے لوگوں کے علم ہی میں نہ آتیں۔ کیوں کہ وہ پیغمبر سے قریبی استفادہ ہی کے ذریعہ معلوم ہوسکتی تھیں۔

عائشہ صدیقہ کی ایک اہم روایت ہے۔ صحیح البخاری میں اس روایت کو اُس کے مختلف پہلوؤں

کی بنا پر کئی باب کے تحت نقل کیا گیا ہے۔اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: **ما خیر رسول اللہ ﷺ بین امرین الا اختار ایسرھما** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان امر کا انتخاب فرماتے)۔

عائشہ صدیقہ اپنی اس روایت میں پیغمبر اسلام کی جنرل پالیسی بیان کرتی ہیں۔ وہ یہ کہ عملی زندگی میں پیغمبر اسلام کا مستقل طریقہ یہ تھا کہ جب بھی آپ کے سامنے دو میں سے ایک کے انتخاب کا سوال ہوتا تو آپ ہمیشہ یہ کرتے کہ مشکل انتخاب (harder option) کو چھوڑ دیتے، اور آسان انتخاب (easier option) کو لے لیتے۔پیغمبر اسلام کی جنرل پالیسی کے بارہ میں یہ نکتہ اتنا زیادہ عمیق ہے کہ اُس کو ایک شخص لمبی صحبت کے بعد ہی اخذ کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ غیر معمولی ذہانت کا حامل ہو۔

اس معاملہ میں پیغمبر اسلام کا کوئی قول انھی الفاظ میں وارد نہیں ہوا ہے۔مگر اس میں شک نہیں کہ اصولاً وہ آپ کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ وہ سیرت رسول کو سمجھنے کے لیے بے حد اہم ہے۔مثلاً مکہ میں آپ نے توحید کے مشن کا آغاز کیا۔اس کی ایک صورت یہ تھی کہ آپ مقدّس کعبہ میں رکھے ہوئے ۳۶۰ بُتوں کو توڑنے سے اپنے مشن کا آغاز کرتے۔مگر آپ نے بتوں کے مسئلہ سے اعراض کرتے ہوئے پُر امن دعوت سے اپنے مشن کا آغاز کیا۔ یہ بلاشبہہ اختیارِ اعسر کے مقابلہ میں اختیارِ ایسر کو لینے کا معاملہ تھا۔

اسی طرح مکی دور کے آخر میں آپ کے سامنے دو میں سے ایک کے انتخاب کا مسئلہ تھا، یا تو مشرکین مکہ سے قتال کریں یا مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے جائیں۔ آپ نے دوسرے طریقہ کا انتخاب کیا جو بلاشبہہ اختیارِ اعسر کے مقابلہ میں اختیار ایسر کو لینے کا معاملہ تھا۔اسی طرح ہجرت کے بعد حدیبیہ کے مقام پر آپ کے لیے دو میں سے ایک کے انتخاب کا سوال تھا۔ یا تو مشرکین کی رکاوٹ کو توڑ کر عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ جانے کی کوشش کریں، یا حدیبیہ سے واپس ہوکر مدینہ آجائیں۔ پہلا طریقہ جنگ کا طریقہ تھا اور دوسرا طریقہ صلح کا طریقہ۔آپ نے اس معاملہ میں صُلح کے طریقہ کو لے لیا جو اختیار اعسر کے مقابلہ میں اختیارِ ایسر کو لینے کے ہم معنیٰ تھا— پیغمبر اسلام کی پوری زندگی اسی حکیمانہ

تدبیر کی مثال ہے۔ عائشہ صدیقہ نے پیغمبر اسلام کے ساتھ تبادلۂ خیال اور آپ کی عملی زندگی کے گہرے مطالعہ کے بعد اس راز کو دریافت کیا اور امت کو بتایا۔ پیغمبر اسلام کی سیرت کا یہ اہم راز غالباً کسی دوسرے مرد یا عورت کے ذریعہ دنیا کو معلوم نہ ہو سکا۔

روایتوں کی تصحیح

عائشہ صدیقہ کا ایک منفرد کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے بہت سی ایسی روایتوں کی تصحیح کی جو پیغمبر اسلام کے قول کی صحیح ترجمانی نہیں کر رہی تھیں۔ پیغمبر اسلام سے جو حدیثیں منقول ہیں وہ زیادہ تر مجلس کی گفتگو سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ کوئی صحابی مجلس کے درمیان میں آیا۔ اُس نے آپ کی گفتگو کا کچھ حصہ سنا اور کچھ حصہ نہیں سُنا۔ اسی طرح کسی صحابی نے پیغمبر اسلام کی ایک بات سُنی مگر وہ اس سے باخبر نہ تھا کہ آپ نے یہ بات کس بیک گراؤنڈ میں کہی ہے۔

اس طرح کے مختلف اسباب سے بعض صحابہ کی روایتوں میں ابہام واقع ہو گیا۔ اُن کی بیان کردہ روایت سے پیغمبر اسلام کی صحیح ترجمانی نہ ہو سکی۔ یہ کام عائشہ صدیقہ نے انجام دیا۔ عائشہ صدیقہ کو آپ کی اہلیہ ہونے کی وجہ سے ہر روز آپ کی صحبت ملتی تھی۔ وہ آپ کی رفیقۂ حیات ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھیں کہ وہ باتوں کو زیادہ تفصیل سے اور زیادہ گہرائی کے ساتھ جان سکیں۔ چنانچہ اپنی اس امتیازی صفت کی بنا پر اُنھوں نے یہ اہم کام انجام دیا کہ صحابہ کی جن روایتوں میں پیغمبر اسلام کے ارشاد کی ترجمانی خلاف واقعہ ہوئی تھی اُن روایتوں کو اُنھوں نے اُن کی صحیح صورت میں پیش کیا۔ روایات میں اس قسم کی تصحیح کو محدثین کی اصطلاح میں استدراک کہا جاتا ہے۔ متعدد ائمہ حدیث نے ان استدراکات کو یکجا کیا ہے۔ اسی قسم کا ایک رسالہ وہ ہے جس کو جلال الدین السیوطی نے تیار کیا۔ اس رسالہ کا نام یہ ہے: **عین الاصابة فی ما استدرکته عائشة علی الصحابة**۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں اس نوعیت کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ صحیح البخاری کی ایک روایت کے مطابق، عبداللہ بن عمر نے غسل کے بارہ میں روایت کرتے ہوئے کہا: **سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من جاء منکم**

الجمعة فليغتسل (میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم میں سے جو شخص جمعہ میں آئے اس کو چاہیے کہ وہ غسل کرے۔

صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ۔

عبداللہ بن عمر نے مذکورہ حدیث کو سادہ طور پر بیان کیا۔ بظاہر اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا ایک مطلق حکم ہے۔ مگر اسی حدیث کو عائشہ صدیقہ نے روایت کیا تو انہوں نے اس کا سبب بھی بیان کردیا۔ یہ سبب اُنہوں نے یقینی طور پر پیغمبر اسلام کی صحبت سے معلوم کیا تھا۔ عائشہ صدیقہ حدیث کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

قالت كان الناس ينتابون الجمعة من منازلهم والعوالی فياتون فی الغبار يصيبهم الغبار والعرق فيخرج منهم العرق فأتی رسول الله صلى الله عليه وسلم انسان منهم و هو عندی فقال النبی ﷺ لو انكم تطهرتم ليومكم هذا (لوگ اپنے اپنے گھروں سے اور مدینہ کے باہر کی آبادیوں سے جمعہ کے روز آتے اور وہ گرد وغبار اور پسینہ میں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن میں سے ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس وقت آپ میرے پاس تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہتر ہوتا اگر تم اس دن غسل کرلیا کرتے)۔

صحیح البخاری، کتاب الجمعۃ (رقم الحدیث ۹۰۲)۔

عبداللہ بن عمر کی روایت میں قول رسول کو مطلق طور پر نقل کیا گیا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ غسل گویا جزءِ نماز ہے۔ مگر عائشہ صدیقہ نے اس قول رسول کو اس کے صحیح پس منظر میں بیان کیا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غسل کی حیثیت ایک جسمانی ضرورت کی ہے، وہ نماز کا عبادتی جزء نہیں۔

۲۔ عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور بعض صحابہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: **ان الميت ليعذب ببكاء أهله عليه** (مردہ پر اُس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے)۔

صحیح البخاری، کتاب الجنائز۔

یہ روایت جب عائشہ صدیقہ کے سامنے بیان کی گئی تو اُنہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن آپ ایک یہودی عورت کے جنازہ پر گذرے، اُس کے رشتہ دار اُس پر رو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ رو رہے ہیں جب کہ اس عورت پر عذاب ہو رہا ہے۔ صحیح البخاری، کتاب الجنائز۔

عائشہ صدیقہ کا کہنا یہ ہے کہ رونا عذاب کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ یعنی نوحہ کرنے والے اس کی موت پر رو رہے ہیں جب کہ مرنے والا اپنے گذشتہ اعمال کی سزا میں مبتلا ہے۔ رونا دوسروں کا فعل ہے جس کا عذاب یہ رونے والے خود اُٹھائیں گے۔ مردہ اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص اپنے فعل کا خود جواب دہ ہے۔

مذکورہ قول رسول کے بارہ میں عائشہ کی یہ وضاحت بتاتی ہے کہ اس طرح کے معاملات میں پیغمبر اور عائشہ کے درمیان باقاعدہ گفتگو ہوتی تھی۔ اس گفتگو کے دوران عائشہ پر وہ باتیں کھلتی تھیں جس سے عام لوگ بے خبر رہتے تھے۔

۳۔ غزوۂ بدر میں جو مشرکین مارے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے مقام دفن پر کھڑے ہو کر فرمایا: **فھل وجدتم ما وعدربکم حقا** (الاعراف ۴۴) خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا کیا تم نے اُس کو سچا پایا۔

صحابہ نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، آپ مردوں کو پکارتے ہیں۔ ابن عمر غالباً عمر سے اور انس بن مالک ابوطلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: **ما انتم باسمع منھم و لکن لا یجیبون** (تم ان سے زیادہ نہیں سنتے لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے)
صحیح البخاری، کتاب الجنائز۔

عائشہ صدیقہ سے جب یہ روایت بیان کی گئی تو اُنھوں نے کہا کہ رسول اللہ نے ایسا نہیں کہا بلکہ آپ نے یہ فرمایا: **انھم لیعلمون الآن انما کنت اقول لھم حق** (اس وقت وہ جان گئے ہیں کہ میں اُن سے جو کچھ کہتا تھا وہ سچ تھا۔

عائشہ صدیقہ نے جو بات کہی وہ گہرے دینی فہم کی بنا پر تھی۔ یہ استثنائی قسم کا گہرا دینی فہم عائشہ کو

کہاں سے ملا۔ اس کا جواب یقینی طور پر صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ دینی فہم اُنہیں پیغمبر اسلام سے قریبی استفادہ کے ذریعہ حاصل ہوا۔

۴۔ کچھ لوگوں نے عائشہ صدیقہ سے آ کر بیان کیا کہ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بدشگونی تین چیزوں میں ہے، عورت میں، گھوڑے میں اور گھر میں۔ عائشہ نے کہا کہ یہ صحیح نہیں۔ ابو ہریرہ نے آدھی بات سُنی اور آدھی نہیں سُنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل یہ فرمایا تھا کہ یہود کہتے ہیں کہ بدشگونی تین چیزوں میں ہے، عورت میں، گھوڑے میں اور گھر میں۔ ابوداؤد طیالسی مسند عائشہ مطبوعہ حیدرآباد۔

عائشہ کی مذکورہ وضاحت بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ اگر اُنہوں نے یہ وضاحت نہ کی ہوتی تو ابو ہریرہ کی روایت کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لیے اس معاملہ میں ایک ابہام باقی رہتا جس کو کوئی دوسرا شخص کھول نہیں سکتا تھا۔

۵۔ عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوبار اللہ کو دیکھا۔ ایک بار معراج کے موقع پر اور دوسری بار اُس موقع پر جس کا ذکر سورہ النجم میں آیا ہے۔ مسروق تابعی نے اس کے حوالہ سے عائشہ صدیقہ سے پوچھا کہ اے ام المؤمنین، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا۔ عائشہ صدیقہ نے کہا کہ تم ایسی بات بولے جس کو سُن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جو تم سے یہ کہے کہ محمد نے خدا کو دیکھا وہ جھوٹ کہتا ہے (**ومن حدثك ان محمدا رأى ربه فقد كذب**) پھر یہ آیت پڑھی: **لا تدركه الابصار و هو يدرك الابصار و هو اللطيف الخبير** (الأنعام ۱۰۳) نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے اور وہ لطیف ہے، خبر رکھنے والا ہے۔ اس کے بعد عائشہ نے یہ دوسری آیت پڑھی: **وما كان لبشر ان يكلمه الله الا وحياً أو من وراء حجاب** (الشوریٰ ۵۱) کسی انسان کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اُس سے باتیں کرے مگر وحی کے ذریعہ یا پردہ کے پیچھے سے۔ (صحیح البخاری، کتاب التفسیر، الجامع للترمذی، تفسیر سورہ النّجم)

عائشہ صدیقہ نے اس معاملہ میں جو وضاحت کی اس کے لیے غیر معمولی دینی جرأت درکار تھی۔

یہ دینی جرأت کسی ایسے ہی شخص میں ہوسکتی ہے جس نے لمبی مدت تک پیغمبر اسلام کی صحبت پائی ہو اور اس طرح کے امور میں پیغمبر اسلام سے تبادلۂ خیال کرکے دین میں گہری بصیرت حاصل کی ہو۔

۶۔ ابوسعید خدری کا انتقال ہونے لگا تو اُنہوں نے نئے کپڑے منگوا کر پہنے۔ اس کا سبب اُنہوں نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان جس لباس میں مرتا ہے، اُسی میں وہ اُٹھایا جاتا ہے۔ عائشہ صدیقہ کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو کہا کہ خدا ابوسعید پر رحم کرے۔ لباس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود انسان کے اعمال ہیں۔ ورنہ آپ کا تو یہ صاف ارشاد ہے کہ لوگ قیامت میں ننگے بدن، ننگے پیر اور ننگے سر اُٹھیں گے۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز

عائشہ صدیقہ کی اس وضاحت سے ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ حدیث کو سمجھنے کے لیے بعض اوقات ضروری ہوتا ہے کہ ایک قول کو اُس کے لفظی معنیٰ میں نہ لیا جائے بلکہ اُس کو علامتی معنیٰ میں لیا جائے۔

۷۔ ایک مرتبہ آپ نے حکم دیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھا جائے۔ ظاہری الفاظ کی بنا پر کچھ صحابہ اس حکم کو دائمی سمجھتے تھے۔ عائشہ صدیقہ نے اس ارشاد کی حکمت بتاتے ہوئے کہا کہ یہ ایک وقتی حکم تھا۔ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ کیا تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے کو رسول اللہ نے حرام کیا ہے۔ عائشہ نے کہا کہ: **لا ولٰکن لم یکن یضحی منھم الا قلیل ففعل ذلک لیطعم من ضحّی من لم یضح** ۔نہیں، اس زمانہ میں چند لوگ قربانی کر سکتے تھے۔ اس لیے آپ نے یہ حکم دیا تاکہ جو قربانی کریں وہ اُن کو کھلائیں جنھوں نے قربانی نہیں کی ہے۔

مسند احمد، جلد ۲، صفحہ ۱۰۲۔

عائشہ صدیقہ کی اس تصحیح سے مزید یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قربانی کے گوشت کو جدید طریقوں کے مطابق، لمبی مدت تک محفوظ رکھنا جائز ہے۔ موجودہ زمانہ کی نسبت سے یہ وضاحت بے حد اہم ہے۔ اگر عائشہ صدیقہ کی یہ وضاحت موجود نہ ہوتی تو مذکورہ حدیث کی حکمت معلوم کرنا ممکن نہ ہوتا اور قربانی کے گوشت کو محفوظ کرکے اس کو دیر تک استعمال کرنا لوگوں کو اسلام کی تعلیم کے خلاف معلوم ہوتا۔

۸۔ عائشہ صدیقہ کے پاس قبیلہ بنو عامر کے دو آدمی آئے۔ انہوں نے کہا کہ ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدشگونی تین چیزوں میں ہے، گھر میں اور عورت میں اور گھوڑے میں۔ عائشہ صدیقہ اس پر بہت زیادہ غصہ ہو گئیں۔ اُنہوں نے کہا کہ اُس ذات کی قسم، جس نے محمد پر قرآن کو اُتارا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہرگز ایسا نہیں کہا۔ آپ نے جو کہا وہ یہ تھا کہ جاہلیت کے لوگ ان تینوں چیزوں سے بدشگونی لیتے تھے۔

مسند الامام احمد بن حنبل، جلد ۶، صفحہ ۲۴۰۔

غالباً راوی نے اپنی سادگی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ آپ نے جو بات جاہلیت کے لوگوں کے بارہ میں کہی تھی اُس کو اُنہوں نے خود رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ مگر عائشہ صدیقہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور مسلسل صحبت رسول کی بنا پر دین کے مزاج کو پوری طرح سمجھ چکی تھیں۔ اس لیے اُنہیں اصل بات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اُنہوں نے راوی کی بات کو سُن کر فوراً اپنے فہم دین کی بنا پر اس حقیقت کو سمجھ لیا اور فوراً اُس کی تردید کر کے اصل بات کو بیان کیا۔

ان چند مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عائشہ صدیقہ کا کنٹری بیوشن اسلام میں کتنا زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی روح کو سمجھنے کے لیے عائشہ کی روایات کا مطالعہ بے حد اہم ہے۔ عائشہ کے ذریعہ بعد کے لوگوں کو جو چیزیں ملیں اُن کا غالباً سب سے زیادہ اہم حصہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور اپنی پوری زندگی اسلام کے لیے وقف کر دینے کے نتیجہ میں گہری دینی بصیرت حاصل کی۔ حتیٰ کہ اس دینی بصیرت میں غالباً کوئی اور ان کا ثانی نہیں۔ پھر اس دینی بصیرت کے تحت اُنہوں نے تقریباً نصف صدی تک امت کو براہ راست رہنمائی دی۔ اور جہاں تک بالواسطہ رہنمائی کا تعلق ہے، وہ آج تک جاری ہے اور بلاشبہہ قیامت تک جاری رہے گی۔

اصل یہ ہے کہ دین کی دو سطحیں ہیں۔ ایک ظاہر دین، اور دوسرا حقیقت دین۔ وہ عورت یا مرد جو ظاہری سطح پر دین کو پائیں انہوں نے گویا ایک پھل کو ایک چھلکے کی سطح پر پایا اور جو عورت یا مرد دین کو

اس کی گہری معنویت کی سطح پر پائیں انہوں نے گویا پھل کے مغز کو پالیا۔ پھل کو پانے والے دراصل یہی دوسری قسم کے لوگ ہیں۔

عائشہ صدیقہ نے خدا کے دین کو اس کی حقیقت اور معنویت کی سطح پر پایا۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو ایک اعلیٰ ربانی شخصیت بنایا بلکہ اپنی زندگی سے انہوں نے اس کی ایک اعلیٰ تاریخی مثال بھی قائم کردی کہ کوئی عورت یا مرد دین میں معرفت کے اس اعلیٰ درجہ کو کس طرح حاصل کرسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام کی ابتدائی عمر میں آپ کا نکاح خدیجہ سے ہوا جو عمر میں آپ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ اور آپ کی عمر کے آخری حصہ میں آپ کا نکاح عائشہ سے ہوا جو عمر میں آپ سے بہت کم تھیں۔ یہ دونوں ہی بے حد اہم تھیں۔ کیوں کہ پیغمبر اسلام کی ابتدائی زندگی میں آپ کو ایک تجربہ کار خاتون کی ضرورت تھی، جب کہ آپ کی آخر عمر میں عائشہ جیسی ایک کم عمر خاتون درکار تھیں، جیسا کہ اگلے باب سے واضح ہوتا ہے۔

عمرِ نکاح کا مسئلہ

عائشہ صدیقہ کے بارہ میں ایک سوال اُن کے نکاح کی عمر سے تعلق رکھتا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں صحیح روایات سے آیا ہے کہ عائشہ صدیقہ کا نکاح پیغمبر اسلام سے مکہ میں ہوا۔ اُس وقت عائشہ صدیقہ کی عمر صرف چھ سال تھی۔ اس کے بعد مدینہ میں ان کی رخصتی ہوئی اور رخصتی کے وقت عائشہ صدیقہ کی عمر ۹ سال تھی۔ **صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب إنکاح الرجل ولدہ الصغار (رقم الحدیث ۵۱۳۳،۵۱۵۸)**

موجودہ زمانہ میں اس کے بارہ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مستشرقین نے عمر کے معاملہ کو لے کر پیغمبر اسلام کی اعلیٰ سیرت پر سوالات اٹھائے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کم سِن لڑکی سے نکاح کرنا شریفانہ اخلاق کے خلاف ہے اور یہ کہ اس قسم کا فعل کسی کی پیغمبری کو مشتبہ ثابت کرتا ہے۔

قدیم زمانہ میں بھی یہ سوال پایا جاتا تھا مگر وہ موجودہ شدت کے ساتھ نہ تھا۔ لوگ فقہی بنیاد پر، نہ کہ اخلاقی بنیاد پر سوال کرتے تھے کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک زیادہ عمر کا انسان کم عمر غیر بالغ بچی سے نکاح کرے۔ اس کا جواب قدیم علماء نے روایتی انداز میں دینے کی کوشش کی۔ مثلاً ابن حزم نے ابن شبرمہ سے اُن کا جواب ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ اُن کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عائشہ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کرنا آپ کی نبوت کے خصائص میں سے تھا **(وزعم ان تزویج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عائشۃ وھی بنت ست سنین کان من خصائصہ)۔**

ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، القاھرہ ۱۹۸۷، جلد ۹، صفحہ ۹۷

یہ توجیہ غیر منطقی ہے۔ کیوں کہ نبی کے خصائص اس کے پیغمبر خدا ہونے کے اعتبار سے ہوتے ہیں، نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔ چنانچہ کسی اور پیغمبر سے اس قسم کا نکاح ثابت نہیں۔

موجودہ زمانہ میں علماء نے مختلف انداز سے اس مسئلہ کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا سید سلیمان ندوی اپنی کتاب میں اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حضرت

عائشہ کا جب نکاح ہوا تھا تو وہ اُس وقت چھ برس کی تھیں۔ اس کم سِنی کی شادی کا اصل منشا نبوت اور خلافت کے درمیان تعلقات کی مضبوطی تھی۔ ایک تو خود عرب کی گرم آب و ہوا میں عورتوں کے غیر معمولی نشو ونما کی طبعی صلاحیت ہے، دوسرے عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس طرح ممتاز اشخاص کے دماغی اور ذہنی قویٰ میں ترقی کی غیر معمولی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح قد وقامت میں بھی بالیدگی کی خاص قابلیت ہوتی ہے۔ اس کو انگریزی میں پری کانشس کہتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، صفحہ ۲۴۔

سید سلیمان ندوی کی کتاب میں اس لفظ کو پری کانشس لکھا گیا ہے۔ کتاب میں اس کی انگریزی اسپلنگ درج نہیں۔ میرے خیال کے مطابق، غالباً مصنف کی مراد جس انگریزی لفظ سے ہے وہ پری کانشس نہیں ہے بلکہ وہ (precocious) ہے۔ پری کاشش کا مطلب انگریزی زبان میں قبل از وقت نشو ونما ہے:

> Precocious: Ripe before the proper or natural time, premature, developed or matured earlier than usual (Webster)
>
> (of a child) having developed particular abilities and ways of behaving at a much younger age than usual, sexually precocious (Oxford)

اگرچہ حدیث یا تاریخ سے ثابت نہیں کہ عائشہ صدیقہ کا کیس قبل از وقت بالیدگی کا کیس تھا۔ اس معاملہ میں یہ تمام تر ایک مفروضہ ہے۔ تاہم اصل مسئلہ کی نسبت سے یہ جواب ایک غیر متعلق جواب ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ صحیح روایات میں عددی تعین کے ساتھ یہ بات آئی ہے کہ چھ سال میں نکاح اور نو سال میں رخصتی۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اُس وقت پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اصل سوال عمر میں اسی ثابت شدہ فرق کے بارہ میں ہے، نہ کہ بالیدگی کے بارہ میں۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ: ”عربوں میں شادی سے پہلے، رشتہ کے متعلق بات طے

کر لینے کا رواج تھا۔ یہ وہی چیز تھی جسے ہمارے ہاں نسبت ٹھہرانا یا منگنی کرنا کہتے ہیں۔ قرآن میں صرف نکاح کا ذکر ہے، نسبت اور منگنی کا نہیں۔ لہٰذا روایات میں جو کہا گیا ہے کہ عائشہ کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوا اور رخصتی نو برس کی عمر میں، تو وہاں نکاح سے مقصود، عربی معاشرہ کی رسم کے مطابق، رشتہ کی بات چیت کا طے پانا (یا منگنی کرنا) ہے اور رخصتی سے مراد شادی ہے۔''

(غلام احمد پرویز، طاہرہ کے نام خطوط، عائشہ کی عمر، صفحہ ۱-۲)

یہ توجیہ بھی درست نہیں۔ احادیث میں جب نکاح کا لفظ آیا ہے تو اس کو ہمیں نکاح کے معروف معنیٰ ہی میں لینا ہوگا۔ نکاح کے لفظ کو کسی اور معنیٰ میں لینے کے لیے خود متن حدیث میں اس کا ثبوت ملنا چاہیے جو کہ موجود نہیں۔ مزید یہ کہ اس توجیہ سے اصل اعتراض ختم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ نکاح کی عمر خواہ چھ سال مانی جائے یا نو سال، دونوں حالتوں میں وہ کم عمری ہی کی شادی ہے۔ پھر اس توجیہ کا کیا فائدہ۔

اسی طرح کچھ لوگ ایک اور نکتہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: عائشہ صدیقہ نے صحابہ کی مرویات پر تنقید کی اور کہا: ''میں یہ تو نہیں کہتی کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں لیکن کان سننے میں غلطی کر جاتے ہیں۔'' بخاری و مسلم میں اس قسم کی متعدد تنقیدات موجود ہیں۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات راوی انتہائی معتبر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی بیان کردہ روایت غلط ہو جاتی ہے۔

کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ راوی نے ادھوری بات سنی ہوتی ہے۔ کبھی راوی مفہوم غلط سمجھ بیٹھتا ہے، کبھی اس سے بھول واقع ہوتی ہے۔ ہم بھی بقول ام المومنین یہ کہتے ہیں کہ راوی سے سُننے میں غلطی ہوئی۔ جملہ بولا گیا تھا تسع عشر (انّیس) راوی نے صرف تسع (نو) کا لفظ سُنا اور اس طرح اس داستان نے جنم لیا کہ بعض اوقات کان سننے میں غلطی کرتے ہیں۔''

(حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی، عمر عائشہ، مطبوعہ کراچی، اکتوبر ۱۹۹۴ء، صفحہ ۸-۹)

یہ قیاس بھی درست نہیں۔ عائشہ صدیقہ کا مذکورہ اصول وہاں قابلِ انطباق ہوگا جہاں روایت

کرنے والا اور روایت کی تردید کرنے والا دونوں یکساں طور پر سامع کی حیثیت رکھتے ہوں۔ ایک سامع دوسرے سامع کے بارہ میں کہہ سکتا ہے کہ اُس نے سننے میں غلطی کی، میرے سننے کے مطابق، اصل بات یہ تھی۔ مگر ایک غیر سامع جو بات کو سننے میں شریک نہ ہو وہ مذکورہ قیاس کی بنیاد پر تردید کا حق نہیں رکھتا۔ اس قسم کا استدلال سراسر غیر معقول ہے۔ اگر اس توسیعی قیاس کو ایک درست اصول مان لیا جائے تو کوئی شخص ایسے قیاسات پیش کرسکتا ہے جو پورے دین کا حُلیہ بگاڑ دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں بحث کا نقطۂ آغاز یہ نہیں ہے کہ ایک کم عمر لڑکی کی شادی زیادہ عمر کے انسان سے کیوں ہوئی۔ بلکہ اس معاملہ میں بحث کا صحیح نقطۂ آغاز یہ ہے کہ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ عائشہ صدیقہ تاریخ کی ایک استثنائی شخصیت کیوں بن گئیں۔ اس معاملہ میں پہلے واقعہ کو دوسرے واقعہ کے تابع کرکے دیکھا جائے گا، نہ کہ اُس کے برعکس۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ پوری مسلم تاریخ میں عائشہ صدیقہ اپنے رول کے اعتبار سے ایک منفرد اور ممتاز شخصیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دینِ اسلام کی روح کو اُنھوں نے جتنی گہرائی کے ساتھ سمجھا اُتنی گہرائی کے ساتھ کسی بھی دوسرے مرد یا عورت نے نہیں سمجھا۔ دین کے نازک پہلوؤں کی تشریح میں وہ جس یقین کے ساتھ بولتی ہیں اس یقین کے ساتھ کوئی بھی دوسرا شخص بول نہ سکا۔ اُنھوں نے دین کی حکمتوں کی جس طرح وضاحت کی ہے اُس طرح وضاحت کرنے والا کوئی بھی دوسرا شخص نظر نہیں آتا، نہ دورِ صحابہ میں اور نہ دورِ صحابہ کے بعد۔ اسی سوال کے جواب میں اصل مسئلہ کا جواب چھپا ہوا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دین میں سب سے بڑی چیز معرفت ہے۔ یہ معرفت پیغمبر کو کامل درجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ پیغمبر کو یہ معرفت جبرئیل کے واسطہ سے براہ راست خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر کے بعد یہ معرفتِ کامل کس طرح کسی کو ملے۔ اسی معرفتِ کامل کا مہبط بننے کے لیے عائشہ صدیقہ کو چنا گیا۔ عملی طور پر اس کی صرف ایک صورت تھی، اور وہ یہ کہ عائشہ کو ابتدائی عمر ہی میں پیغمبر کی صحبت کا موقع دے دیا جائے۔ اس معرفت کامل کے لیے صحبت کامل درکار تھی۔ اور کسی انسان کے ساتھ صحبتِ کامل کا موقع صرف اُس کی بیوی کو مل سکتا ہے، کسی اور کو نہیں۔

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بچہ اپنی ابتدائی عمر میں بے حد متجسّس (inquisitive) ہوتا ہے۔ وہ اپنے باہر کی باتوں کو جاننے کے لیے بے حد شائق (eager to learn) ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ بچہ اپنی ابتدائی عمر میں بہت تیز ذہن (sharp mind) ہوتا ہے۔ وہ نئی نئی چیزوں کو فی الفور پکڑتا ہے۔ مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ ابتدائی عمر میں ہر مرد اور ہر عورت کا حافظہ بہت قوی ہوتا ہے۔ ابتدائی عمر میں جو باتیں انسان کے علم میں آجائیں وہ پھر کبھی اُس کو نہیں بھولتیں۔ ابتدائی عمر سے بچوں کی اسکولنگ شروع کرنے کا نظریہ اسی خاص اُصول پر قائم ہے۔

عائشہ صدیقہ نہایت ذہین خاتون تھیں۔ اُن کو بے حد اَخّاذ طبیعت ملی تھی۔ اس لیے یہ خدا کی منشا ہوئی کہ اُن کو کم عمری میں پیغمبر کی مستقل صحبت میں دے دیا جائے۔ اور اس مستقل صحبت کی عملی صورت صرف یہ تھی کہ وہ آپ کی زوجہ کی حیثیت سے آپ کی شریکِ زندگی بن جائیں۔ اسی خاص منصوبہ کے تحت عائشہ صدیقہ کو کم عمری میں پیغمبر اسلام کی زوجیت میں دے دیا گیا۔

یہ نکاح بظاہر ایک غیر رواجی نکاح تھا۔ وہ مروجہ طریقہ کے خلاف تھا۔ اس بنا پر عین ممکن تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قبول نہ کرتے۔ حتیٰ کہ یہ امکان تھا کہ وہ اس رشتہ کو قابل غور بھی نہ سمجھیں۔ غالباً اسی نزاکت کی بنا پر یہ ہوا کہ خدا کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس غیر معمولی رشتہ کے بارہ میں اُس نے آپ کو پیشگی خبر دی تاکہ آپ کو اس معاملہ میں تردد نہ رہے۔ یہ تقریباً ویسا ہی ایک معاملہ تھا جو اس سے پہلے مریم کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ مریم کو اس پر سخت تردد ہوسکتا تھا کہ اُن کے یہاں بغیر باپ کے ایک بچہ پیدا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے پاس پیشگی طور پر ایک فرشتہ بھیجا۔ اُس نے انسان کی صورت اختیار کرکے مریم کو اس معاملہ کی خبر دی۔ اس کا ذکر قرآن میں واضح الفاظ میں آیا ہے (مریم ۱۷-۱۹)۔

اس رشتہ کے بارہ میں فرشتہ کا پیشگی خبر دینا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کہا کہ مجھ کو خواب میں تمہیں دکھایا گیا کہ ایک فرشتہ ریشم کے کپڑے میں تم کو لے کر آتا ہے۔ فرشتہ نے کہا کہ یہ تمہاری بیوی ہے۔ میں نے تمھارے چہرے

سے کپڑا اٹھایا۔ پھر دیکھا کہ تم ہو۔ میں نے کہا کہ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو یہ پورا ہو کر رہے گا:

عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: قال لی رسول صلی اللہ علیہ وسلم: اُريتك فی المنام يجئ بك الملك فی سرقة من حرير، فقال لی: هذه امرأتك فكشفت عن وجهكِ الثوب، فاذا انت هی، فقلت: ان يك هٰذا من عند اللّٰہ يُمضهٖ۔(صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب النظر الی المرأة قبل التزويج ،رقم الحديث ۵۱۲۵)

عائشہ صدیقہ پیغمبر اسلام کے ساتھ گیارہ سال تک رہیں۔ چوں کہ اُن کی عمر آپ کے مقابلہ میں بہت کم تھی، پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد وہ تقریباً پچاس سال تک زندہ رہیں۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد وہ تقریباً نصف صدی تک علم نبوت کی اشاعت کا ذریعہ بنی رہیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ عائشہ صدیقہ نے دین کی ایسی گہری حکمتیں بتائیں جو کسی دوسرے صحابی کے ذریعہ امت کو نہیں مل سکیں۔ مزید یہ کہ پیغمبر کی مسلسل صحبت سے اُن کو اپنے تصورات دین کی صداقت پر غیر معمولی یقین حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نازک دینی مسائل میں جس قطعیت کے ساتھ بولتی ہیں اُس طرح بولنے کی جرأت کوئی دوسرا نہ پہلے کر سکا اور نہ اب کر سکتا ہے۔

مثلاً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عقیدت مندی کے تحت ایسی رائے بنا لیتے ہیں جو حقیقتِ واقعہ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ پھر جب ایسی باتیں پھیل جائیں تو عام آدمی کو اس کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اُس کی تردید کرے۔ ایسے موقع پر غیر معمولی بصیرت درکار ہوتی ہے۔ غیر معمولی بصیرت کا حامل انسان ہی ایسے موقع پر کوئی قطعی بات کہنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ عائشہ صدیقہ کو پیغمبر اسلام کی مسلسل صحبت سے یہی بصیرت ملی تھی۔ جس کی بنا پر وہ کامل یقین کے ساتھ کلام کر سکتی تھیں۔ مثلاً وفاتِ رسول کے بعد دورِ تابعین میں یہ کہا جانے لگا کہ پیغمبر اسلام نے اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عائشہ صدیقہ نے اس کو سُنا تو وہ غضبناک ہو گئیں۔ اُنہوں نے کہا کہ: **ومن حدثک ان محمدا رأى ربه فقد كذب** (جو تم سے یہ کہے کہ محمد نے خدا کو دیکھا وہ جھوٹ کہتا ہے) **صحيح البخاری، كتاب التفسير، الجامع للترمذی، تفسير سوره النجم۔**

اسی طرح وفات رسول کے بعد جو زمانہ آیا اُس زمانہ میں ''ختم قرآن'' کا طریقہ رائج ہوگیا۔ لوگ قرآن میں تدبّر کے بجائے اس کو اہمیت دینے لگے کہ لفظی تلاوت کے ذریعہ بار بار قرآن کو ختم کیا جاتا رہے۔ اس ختم پر بڑے بڑے ثواب بتائے جانے لگے۔ یہ بات عائشہ صدیقہ کو معلوم ہوئی۔ اُن کو بتایا گیا کہ فلاں لوگ ایک دن کے اندر اتنی بار قرآن ختم کر لیتے ہیں۔ عائشہ صدیقہ نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ: **اولٰئک قرؤا ولم یقرؤا** (اُنھوں نے پڑھا مگر اُنھوں نے نہیں پڑھا) مسند احمد، جلد ۶، صفحہ ۹۲۔

زوجۂ رسول ہونے کی وجہ سے لوگ اس طرح کی نازک چیزوں میں عائشہ صدیقہ کی بات پر یقین کر سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا شخص ایسا بیان دے تو لوگوں کے لیے اُس پر یقین کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ایک روایت ہے جس میں یوسف بن ماھک کہتے ہیں کہ میں ام المومنین عائشہ کے پاس تھا۔ اتنے میں ان کے پاس ایک عراقی شخص آیا۔ اس نے کہا کہ کون سا کفن بہتر ہے۔ عائشہ صدیقہ نے جواب دیا کہ تمھارا برا ہو اس میں تمھارا کیا نقصان ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اے ام المومنین، مجھ کو اپنا مصحف (قرآن) دکھایئے۔ انھوں نے کہا کہ کس لئے۔ اس نے کہا تا کہ میں اس کے مطابق ایک قرآن تیار کروں کیوں کہ وہ مختلف ترتیب سے پڑھا جارہا ہے۔ عائشہ نے کہا کہ تمھارا اس میں کیا نقصان ہے، جس طرح تم پہلے پڑھ رہے تھے وہی پڑھو۔

أخبرني يوسف بن ماهك: قال إني عند عائشة أم المؤمنين رضى اللّٰه عنها إذجاء ها عراقي، فقال: أى الكفن خير؟ قالت: ويحك وما يضرك، قال يا أم المومنين أريني مصحفك، قال لم؟ قال لعلي أؤلف القرآن عليه فإنه يقرأ غير مؤلف قالت وما يضرك أيهُ قرأت قبلُ (ابن حجر العسقلانى، فتح البارى الجزء الثامن، ٦٥٥، رقم الحديث ٤٩٩٣).

عائشہ صدیقہ نے اس گفتگو میں جس یقین اور وضاحت کے ساتھ روح اسلام کی نمائندگی کی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ اس یقین اور وضاحت کے ساتھ بولنا اُن کے لیے صرف اس بنا پر ممکن ہو سکا

کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی قریبی صحبت سے اسلام کی روح کو بھرپور طور پر سمجھ چکی تھیں۔ وہ کسی ادنیٰ شبہہ کے بغیر جانتی تھیں کہ اس معاملہ میں اسلام کا تقاضا کیا ہے۔

عائشہ صدیقہ کی فہم و بصیرت کے متعلق اس طرح کی کچھ اور مثالیں اس کتاب کے دوسرے ابواب میں ملیں گی۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عائشہ کی نکاح کے بارہ میں عمر کا مسئلہ صرف ایک اضافی مسئلہ ہے۔ اس معاملہ میں اصل فیصلہ کن بات یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کی جس مصلحت کے تحت یہ نکاح ہوا اس کا کوئی بھی بدل سِرے سے موجود نہ تھا۔

نکاح کی حکمت

جیسا کہ معلوم ہے، عائشہ صدیقہ کا نکاح جب پیغمبر اسلام سے ہوا اُس وقت اُن کی عمر دس سال سے کم تھی۔ نکاح کے بعد وہ پورے مدنی دور میں پیغمبر اسلام کے ساتھ رہیں۔ یہ مدنی دور جو دس سال پر مشتمل ہے، اسلام کی ابتدائی تاریخ کا سب سے زیادہ پُراز واقعات (eventful) دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پورے مدنی دور میں وہ مسلسل طور پر پیغمبر اسلام کے ساتھ رہیں، حتیٰ کہ وہ سفر میں بھی آپ کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس طرح یہ دس سالہ زمانہ عائشہ صدیقہ کے لیے گویا ایک زندہ مدرسہ کے ساتھ وابستگی کا زمانہ ہے۔

کم عمری میں عائشہ صدیقہ کا نکاح جب پیغمبر اسلام کے ساتھ ہوا اُس کا اصل مقصد یہی تھا۔ عائشہ صدیقہ اُس وقت اپنی عمر کے اس حصہ میں تھیں جس کو تشکیلی دور (formative period) کہا جاتا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تقریباً دس سال کی عمر تک ہر مرد اور عورت کا ذہن بڑی حد تک بن جاتا ہے۔ اُس کی کنڈیشننگ اتنی زیادہ ہو چکی ہوتی ہے کہ بعد کے مرحلہ میں اُس کو توڑنا بے حد مشکل ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عائشہ صدیقہ کے والد ابوبکر صدیق نے اس راز کو سمجھا۔ اُنہوں نے سوچے سمجھے نقشہ کے مطابق، اپنی ذہین صاحبزادی کا نکاح کم عمری میں پیغمبر اسلام کے ساتھ کر دیا۔ یہ کام خلیفۂ اوّل ابوبکر صدیق کی کامل رضامندی کے تحت پیش آیا۔ اس میں بیک وقت گہرا اخلاص بھی شامل تھا اور اسی کے ساتھ اعلیٰ ہوش مندی بھی۔

اس نکاح یا دوسرے لفظوں میں، تعلیمی منصوبہ بندی کا وہ نتیجہ سامنے آیا جو پوری انسانی تاریخ میں غالباً واحد مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس منصوبہ بندی کے نتیجہ میں عائشہ صدیقہ جیسی ایک قابل شخصیت تیار ہوئی جس کو اپنی عمر کے ریسیپٹیو (receptive) مرحلہ میں پیغمبر کامل کی صحبت میں اپنے آپ کو تیار کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح وہ علمِ نبوت کی مکمل وارث بن گئیں اور پھر پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد تقریباً پچاس سال تک لوگوں کے درمیان علمِ نبوت کی اشاعت کرتی رہیں۔ وہ گویا پرنٹنگ پریس اور ٹیپ ریکارڈر کے دور سے پہلے پیغمبر اسلام کی ایک زندہ ٹیپ ریکارڈر بن گئیں۔

نبوت کی علمی فیض رسانی کا یہ سلسلہ عائشہ صدیقہ کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد بھی لمبی مدت تک جاری رہا۔ ایسا صرف اس لیے ممکن ہوا کہ اُن کا نکاح کم عمری میں پیغمبر اسلام کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا کہ جو عمر پیغمبر اسلام کی تھی تقریباً وہی عمر عائشہ صدیقہ کی بھی ہوتی تو دونوں کی وفات کسی قدر فرق کے ساتھ ایک ہی وقت میں ہو جاتی۔ جب پیغمبر اسلام کی زبان بند ہوتی تو عائشہ صدیقہ کی زبان بھی ساتھ ہی بند ہو جاتی اور علمِ نبوت کی فیض رسانی کا سلسلہ بھی اچانک ٹوٹ جاتا۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ پیغمبر سے اکتساب علم کا یہ معاملہ کسی مرد کے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک خاتون درکار تھیں جو زوجہ کی حیثیت سے مستقل طور پر آپ کے ساتھ رہیں۔ مسلسل صحبت کا تعلق صرف زوجہ کے ساتھ ہوسکتا تھا، نہ کہ کسی عام مرد کے ساتھ۔ ان مصلحتوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو عائشہ صدیقہ کا مذکورہ نکاح ایک ایسا دور رس منصوبہ تھا جس کا فائدہ قیامت تک کے لیے پوری انسانیت کو حاصل ہوا۔ اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے اور اُس پر غیر جانبدارانہ انداز سے رائے قائم کی جائے تو یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جو ہوا وہی ہوسکتا تھا۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے کوئی دوسرا متبادل سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

دین اسلام کا اصل ماخذ قرآن وحدیث ہے۔ قرآن وحدیث کو اسلام کا متن (text) کہہ سکتے ہیں۔ یہ متن گویا دینِ اسلام کا لفظی بیان (literal statement) ہے۔ جو آدمی یہ جاننا چاہے کہ اسلام کیا ہے وہ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے اس کو معلوم کرسکتا ہے۔

تاہم ایک اور چیز ہے جس کی دین میں بے حد اہمیت ہے اور وہ صحبت ہے۔ صحبت کا مطلب مجلس میں خاموش بیٹھنا نہیں ہے بلکہ اس میں فکری تبادلہ (intellectual exchange) لازمی طور پر شامل ہے۔ حقیقی معنوں میں صحبت یافتہ وہ ہے جو مجلس میں اس طرح شرکت کرے کہ وہ صاحبِ مجلس سے باقاعدہ استفادہ کررہا ہو۔ وہ سوال وجواب کی صورت میں اپنے علم کو بڑھا رہا ہو۔ وہ غیر واضح امور کو مزید گفتگو کے ذریعہ واضح بنا رہا ہو اور اسی کے ساتھ وہ صاحب مجلس کے تجربہ، اس کی روحانیت، اور اس کی خدارسیدگی سے شخصی فیض حاصل کررہا ہو۔

صحابۂ کرام اسی صحبت رسول کی عملی مثالیں ہیں۔ مگر عائشہ کی صورت میں ایک استثنائی مثال قائم کی گئی جو صحبت کی کامل مثال تھی۔ جو صحبت کے فوائد کا کامل نمونہ تھی۔ مزید یہ کہ یہ نمونہ ایک ایسا نمونہ بن گیا جو پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد بھی لمبی مدت تک لوگوں کو صحبت کی اہمیت سے آگاہ کرتا رہے۔

عائشہ صدیقہ گویا صحبت کی زندہ تفسیر ہیں۔ اُن کی زندگی میں صحبت کے اُصول نے گویا ایک ادارہ (institution) کی صورت اختیار کرلی۔ اب اس ادارہ کو امت کے اندر مستقل طور پر زندہ رکھنا ہے۔ ہر نسل کے سینئر افراد کو چاہیے کہ وہ اگلی نسل کے مردوں اور عورتوں کو صحبت کا یہ فیض پہنچاتے رہیں۔ تاکہ دینِ اسلام نہ صرف متن (text) کے اعتبار سے محفوظ رہے بلکہ صحبت کے ادارہ کی صورت میں اس کا ذہنی اور روحانی فیض بھی ہمیشہ جاری رہے۔

چند تاریخی خواتین

پیغمبروں کی تاریخ میں چند خواتین ایسی ملتی ہیں جو پوری انسانیت کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر چہ تمام پیغمبروں اور اُن کے اہل خانہ کے حالات ہمارے علم میں نہیں ہیں، تاہم قرآن یا حدیث کے ذریعہ جو حالات ہمارے علم میں آئے ہیں اُن میں سے چند خواتین نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ مختلف پہلوؤں سے ساری انسانیت کے لیے نمونہ ہیں۔ یہاں مختصر طور پر چند ایسی خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ہاجرہ ام اسماعیل

اس سلسلہ میں ایک نام حضرت ہاجرہ (یا ھاجر) کا ہے۔ وہ پیغمبر ابراہیم کی بیوی تھیں۔ اُن سے ایک اولاد پیدا ہوئی جن کا نام اسماعیل رکھا گیا۔ ایک خدائی منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیم نے ہاجرہ اور اُن کے چھوٹے بچے کو عرب میں مکہ کے مقام پر لے جا کر بسا دیا جو اُس وقت بالکل غیر آباد تھا۔ اس واقعہ کے بارہ میں قرآن میں مختصر طور پر یہ حوالہ ملتا ہے:

> اور جب ابراہیم نے کہا، اے میرے رب، اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے۔ اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک بے کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور اُن کو پھلوں کی روزی عطا فرما۔ تاکہ وہ شکر کریں۔ (ابراہیم ۳۵-۳۷)

ہاجرہ کے بارہ میں قرآن میں صرف مختصر اشارہ آیا ہے۔ تاہم حدیث کی مشہور کتاب صحیح البخاری

میں ہاجرہ کے بارہ میں تفصیلی روایت موجود ہے۔ یہ روایت یہاں نقل کی جاتی ہے:

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ عورتوں میں سب سے پہلے ہاجرہ نے کمر پٹّہ باندھا تاکہ سارہ کو اُن کے بارہ میں خبر نہ ہو سکے۔ پھر ابراہیم، ہاجرہ اور اُن کے بچے اسماعیل علیہ السلام کو مکّہ میں لے آئے۔ اُس وقت ہاجرہ اسماعیل کو دودھ پلاتی تھیں۔ ابراہیم نے ان دونوں کو مسجد کے اوپری حصہ میں ایک بڑے درخت کے نیچے بٹھا دیا جہاں زمزم ہے۔ اُس وقت مکہ میں ایک شخص بھی موجود نہ تھا اور نہ ہی وہاں پانی تھا۔ ابراہیم نے کھجور کا ایک تھیلہ اور پانی کی ایک مشک وہاں رکھ دیا اور خود وہاں سے روانہ ہوئے۔ ہاجرہ اُن کے پیچھے نکلیں اور کہا کہ اے ابراہیم، ہم کو اس وادی میں چھوڑ کر آپ کہاں جا رہے ہیں جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی اور چیز۔ ہاجرہ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ بات کئی بار کہی اور ابراہیم نے ہاجرہ کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہاجرہ نے ابراہیم سے کہا کہ کیا اللہ نے آپ کو اسی کا حکم دیا ہے۔ ابراہیم نے کہا کہ ہاں۔ ہاجرہ نے کہا پھر تو اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ ہاجرہ لوٹ آئیں۔ ابراہیم جانے لگے۔ یہاں تک کہ جب وہ مقامِ ثنیہ پہنچے جہاں سے وہ دکھائی نہیں دیتے تھے تو اُنہوں نے اپنا رخ ادھر کیا جہاں اب کعبہ ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا کی کہ: اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسی وادی میں بسایا ہے جہاں کچھ نہیں اُگتا۔ یہاں تک کہ آپ لفظ یشکرون تک پہنچے۔

ہاجرہ اسماعیل کو دودھ پلاتیں اور مشک میں سے پانی پیتیں۔ یہاں تک کہ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو وہ پیاسی ہوئیں اور ان کے بیٹے کو بھی پیاس لگی۔ انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ پیاس سے بے چین تھا۔ بیٹے کی اس حالت کو دیکھ کر مجبور ہو کر وہ نکلیں۔ انہوں نے سب سے قریب پہاڑ صفا کو پایا۔ چنانچہ وہ پہاڑ پر چڑھیں اور وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ کوئی شخص نظر آ جائے۔ وہ کسی کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ صفا سے اتریں۔ یہاں تک کہ جب وہ وادی تک

پہنچیں تو اپنے کُرتہ کا ایک حصہ اُٹھایا پھر وہ تھکاوٹ سے چور انسان کی طرح دوڑیں۔ وادی کو پار کر کے وہ مروہ پہاڑ پر آئیں۔ اُس پر کھڑے ہو کر اُنہوں نے دیکھا تو کوئی انسان نظر نہ آیا۔ اس طرح اُنہوں نے صفا و مروہ کے درمیان سات چکر کیے۔ عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ ان دونوں کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ پھر وہ مروہ پر چڑھیں۔ اُنہوں نے ایک آواز سُنی۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگیں کہ چپ رہ۔ پھر سُننا چاہا تو وہی آواز سُنی۔ اُنہوں نے کہا کہ تو نے اپنی آواز مجھ کو سنادی تو اس وقت ہماری مدد کر سکتا ہے۔ دیکھا تو مقام زمزم کے پاس ایک فرشتہ ہے۔ فرشتہ نے اپنی ایڑی یا پنکھ زمین میں ماری، پانی نکل آیا۔ ہاجرہ اُس کو حوض کی طرح بنانے لگیں اور ہاتھ سے اُس کے گرد مینڈ بنانے لگیں۔ وہ پانی چلّو سے لے کر اپنی مشک میں بھرتیں۔ وہ جس قدر پانی بھرتیں چشمہ اُتنا ہی زیادہ اُبلتا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ ہاجرہ پر رحم کرے، اگر وہ زمزم کو اپنے حال پر چھوڑ دیتیں یا آپ نے یہ فرمایا کہ اگر وہ چلّو بھر کر پانی نہ لیتیں تو زمزم ایک بہتا چشمہ ہوتا۔ ہاجرہ نے پانی پیا اور اپنے بیٹے کو پلایا۔ فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا کہ تم ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو۔ یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہ بچہ اور اُس کے باپ دونوں اس گھر کو بنائیں گے اور اللہ اپنے گھر والوں کو ضائع نہیں کرتا۔ اُس وقت گھر (کعبہ) ٹیلے کی طرح زمین سے اونچا تھا۔ سیلاب آتا اور وہ اس کے دائیں بائیں جانب سے نکل جاتا۔ کچھ دنوں تک ہاجرہ نے اسی طرح زندگی گذاری۔ یہاں تک کہ جرہم قبیلہ کے کچھ لوگ یا جرہم کے گھر والے کدا کے راستہ سے آرہے تھے۔ وہ مکہ کے نشیبی حصہ میں اُترے۔ اُنہوں نے وہاں ایک پرندہ کو دیکھا جو گھوم رہا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ پرندہ تو پانی پر گھومتا ہے۔ ہم اس وادی میں رہے ہیں اور یہاں پانی نہ تھا۔ اُنہوں نے ایک یا دو آدمی کو خبر لینے کے لیے بھیجا۔ اُنہوں نے پانی دیکھا۔ وہ واپس لوٹ کر گئے اور لوگوں کو پانی کی خبر دی۔ وہ لوگ بھی آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ پانی کے پاس تھیں۔ اُنہوں نے ہاجرہ سے کہا

کہ کیا تم ہم کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت دیتی ہو۔ ہاجرہ نے کہا کہ ہاں لیکن پانی پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ خود چاہتی تھیں کہ یہاں انسان آباد ہوں۔ اُن لوگوں نے یہاں پر قیام کیا اور اپنے گھر والوں کو بھی بُلا بھیجا، وہ بھی یہیں ٹھہرے۔ جب مکہ میں کئی گھر بن گئے اور اسماعیل جوان ہو گئے اور اسماعیل نے جرہم والوں سے عربی زبان سیکھ لی۔ جرہم کے لوگ اُن سے محبت کرنے لگے تو اُنہوں نے اپنی ایک لڑکی سے اُن کی شادی کر دی۔ ہاجرہ کا انتقال ہو گیا۔ جب اسماعیل کی شادی ہو چکی تو ابراہیم اپنی اولاد کو دیکھنے آئے۔ اُنہوں نے وہاں اسماعیل کو نہیں پایا۔ چنانچہ اُن کی بیوی سے اُن کے بارہ میں پوچھا۔ اُس نے کہا کہ وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں نکلے ہیں۔ ابراہیم نے اُس سے اُن کے گذر بسر اور حالت کے بارہ میں پوچھا۔ اُس نے کہا کہ ہم تکلیف میں ہیں۔ ہم بہت زیادہ تنگی میں ہیں۔ اُس نے ابراہیم سے شکایت کی۔ ابراہیم نے کہا کہ جب تمہارے شوہر آئیں تو تم اُن کو میرا اسلام کہنا اور اُن سے یہ بھی کہنا کہ وہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو بدل دیں۔ جب اسماعیل آئے۔ اُنہوں نے کچھ محسوس کر لیا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہاں۔ ایک بوڑھا شخص اس اس صورت کا آیا تھا۔ اُنہوں نے آپ کے بارہ میں پوچھا، میں نے اُن کو بتایا۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہماری گزر کیسے ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ بڑی تکلیف اور تنگی سے۔ اسماعیل نے کہا کہ کیا اُنہوں نے تم سے اور کچھ کہا ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں۔ اُنہوں نے مجھ سے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو بدل دو۔ اسماعیل نے کہا کہ وہ میرے باپ تھے۔ انہوں نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں تم کو چھوڑ دوں۔ تم اپنے گھر والوں میں چلی جاؤ۔ اسماعیل نے اُس کو طلاق دے دی۔ اور جرہم کی ایک دوسری عورت سے اُنہوں نے شادی کر لی۔ ابراہیم اپنے ملک میں ٹھہرے رہے جس قدر اللہ نے چاہا۔ اس کے بعد ابراہیم اسماعیل کے یہاں آئے تو پھر اُن کو نہیں

پایا۔ وہ اسماعیل کی بیوی کے پاس آئے اور اُس سے اسماعیل کے بارہ میں پوچھا۔ اُس نے کہا کہ وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں نکلے ہیں۔ ابراہیم نے کہا کہ تم لوگ کیسے ہو۔ اس نے کہا کہ ہم لوگ خیریت سے ہیں اور کشادگی کی حالت میں ہیں۔ اُس نے اللہ عزّ وجل کی تعریف کی۔ ابراہیم نے کہا کہ تمہارا کھانا کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ گوشت۔ ابراہیم نے کہا کہ تم کیا پیتے ہو۔ اُس نے کہا کہ پانی۔ ابراہیم نے دعا کی کہ اے اللہ، تو اُن کے گوشت اور پانی میں برکت دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس وقت مکہ میں اناج نہ تھا۔ اور اگر وہاں اناج ہوتا تو ابراہیم اس میں بھی برکت کی دعا کرتے۔ مکہ کے علاوہ کسی دوسرے ملک کے لوگ اگر گوشت اور پانی پر گزر کریں تو وہ اُن کو موافق نہ آئے۔ ابراہیم نے کہا کہ جب تمہارے شوہر آئیں تو تم اُن کو میرا سلام کہنا اور میری طرف سے اُن کو یہ حکم دینا کہ وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ کو باقی رکھیں۔ پس جب اسماعیل آئے تو اُنھوں نے کہا کہ کیا تمہارے پاس کوئی شخص آیا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہاں، ہمارے پاس ایک اچھی صورت کے بزرگ آئے تھے اور اُس نے آنے والے کی تعریف کی۔ اُنھوں نے مجھ سے آپ کے بارہ میں پوچھا تو میں نے اُنھیں بتایا۔ اُنھوں نے مجھ سے دوبارہ ہمارے گزر بسر کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ ہم خیریت سے ہیں۔ اسماعیل نے کہا کہ کیا انھوں نے تم سے کچھ اور بھی کہا ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں۔ اُنھوں نے آپ کو سلام کہا ہے اور آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو باقی رکھیں۔ اسماعیل نے کہا کہ وہ میرے باپ تھے اور تم چوکھٹ ہو۔ اُنھوں نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے پاس باقی رکھوں۔ پھر ابراہیم اپنے ملک میں ٹھہرے رہے جب تک اللہ نے چاہا۔ اس کے بعد وہ آئے اور اسماعیل زمزم سے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھے اپنے تیر درست کر رہے تھے۔ جب اسماعیل نے ابراہیم کو دیکھا تو وہ کھڑے ہو گئے۔ پس ہم نے وہی کیا جو ایک باپ اپنے بیٹے سے اور ایک بیٹا اپنے باپ سے کرتا ہے۔ ابراہیم نے کہا کہ اے اسماعیل، اللہ نے مجھ کو ایک حکم دیا ہے۔

اسماعیل نے کہا کہ پھر جو آپ کے رب نے حکم دیا ہے اُسے کر ڈالیے۔ ابراہیم نے کہا کہ کیا تم میری مدد کرو گے۔ اسماعیل نے کہا کہ میں آپ کی مدد کروں گا۔ ابراہیم نے کہا کہ اللہ نے مجھ کو یہ حکم دیا ہے کہ میں یہاں ایک گھر بناؤں اور ابراہیم نے اس کے گرد ایک بلند ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا۔ اُس وقت اُن دونوں نے گھر کی بنیاد اٹھائی۔ اسماعیل پتھر لاتے تھے اور ابراہیم تعمیر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب دیوار اونچی ہوگئی تو اسماعیل یہ پتھر (حجر اسود) لائے اور اُس کو وہاں رکھ دیا۔ ابراہیم اُس پتھر پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے تھے اور اسماعیل اُن کو پتھر دیتے تھے۔ اور وہ دونوں کہتے تھے کہ اے ہمارے رب، تو ہماری طرف سے یہ قبول کر، بیشک تو بہت زیادہ سننے والا اور بہت زیادہ جاننے والا ہے۔ پس وہ دونوں تعمیر کرتے اور اس گھر کے اردگرد یہ کہتے ہوئے چکر لگاتے کہ اے ہمارے رب، تو ہماری طرف سے یہ قبول کر۔ بیشک تو بہت زیادہ سننے والا اور بہت زیادہ جاننے والا ہے۔

صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واتّخذ اللہ ابراھیم خلیلاً (رقم الحدیث ۳۳۶۴)

ہاجرہ کے شوہر حضرت ابراہیم بن آزر تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے عراق میں پیدا ہوئے اور ایک سو پچھتّر سال کی عمر پا کر اُن کی وفات ہوئی۔ اُنھوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ مگر شرک اور بُت پرستی کا غلبہ ان لوگوں کے ذہن پر اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ توحید کے پیغام کو قبول نہ کر سکے۔ حضرت ابراہیم نے ایک سے زیادہ جنریشن تک لوگوں کو توحید کا پیغام دیا۔ مگر اس زمانہ میں شرک ایک تہذیب کی صورت اختیار کر کے لوگوں کی زندگی میں اس طرح شامل ہو چکا تھا کہ وہ اس سے الگ ہو کر سوچ نہیں سکتے تھے۔ پیدا ہوتے ہی ہر آدمی کو شرک کا سبق ملنے لگتا تھا۔ یہاں تک کہ ماحول کے اثر سے اُس کا ذہن پوری طرح شرک میں کنڈیشنڈ ہو جاتا تھا۔

اُس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ متمدّن شہروں سے باہر غیر آباد صحرا میں ایک نسل تیار کی جائے۔ اسی مقصد کے لیے حضرت ابراہیم نے

اپنی اہلیہ ہاجرہ اور چھوٹے بچے اسماعیل کو اُس مقام پر لاکر چھوڑ دیا جہاں اب مکہ آباد ہے۔ یہ جگہ مشرکانہ تمدن سے مکمل طور پر خالی تھی۔ یہ فطرت کی ایک دنیا تھی جہاں خدائی تخلیق کے مناظر کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ فطرت کے اس سادہ ماحول میں توالد وتناسل کے ذریعہ ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی۔ اس نسل کے بننے میں دو ہزار سال سے زیادہ کی مدت لگ گئی۔ پھر وہ وقت آیا جب کہ اس نسل کے اندر پیغمبر آخر الزماں کا ظہور ہوا۔ اس نسل کو تاریخ میں بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ یہ بنو اسماعیل گویا بالقوہ مسلمان (potentially Muslims) تھے۔

چنانچہ انبیاء کی طویل تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ پیغمبر آخر الزماں کو بہت کم مدت میں طاقتور ساتھیوں کی ایک ٹیم مل گئی۔ اس ٹیم نے جس کو اصحابِ پیغمبر کہا جاتا ہے، اپنی مجاہدانہ قربانیوں کے ذریعہ توحید کو ایک نظریاتی تحریک سے اُٹھا کر عملی انقلاب تک پہنچا دیا۔ ایسے انقلاب کو واقعہ بنانے کے لیے ایک جاندار ٹیم درکار تھی، اور یہ جاندار ٹیم بلاشبہہ ہاجرہ کی قربانی کے ذریعہ بن کر تیار ہوئی۔

جیسا کہ البخاری کی مذکورہ روایت سے واضح ہوتا ہے، اس موحّدانہ انقلاب میں ہاجرہ کا رول بے حد بنیادی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہاجرہ کی بے مثال قربانی کے ذریعہ یہ ممکن ہوا کہ تاریخ کا وہ عظیم واقعہ ظہور میں آئے جس کو اسلامی تاریخ کہا جاتا ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مشہور انگریزی مثل اگر سب سے زیادہ کسی خاتون پر صادق آتی ہے تو وہ ہاجرہ ہیں:

There is a woman at the beginning of all great things.

حج کی سالانہ عبادت کے لیے مکّہ جانے والے تمام حاجی صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کرتے ہیں۔ یہ دراصل ہاجرہ کی سعی کی تقلید ہے۔ اللہ کو ہاجرہ کی یہ سعی اتنی پسند آئی کہ اُس نے حکم دے دیا کہ تمام دنیا کے مسلمان جو حج کی عبادت کے لیے مکہ آئیں وہ ہاجرہ کے نقشِ قدم کی پیروی کریں۔

آسیہ بنت مزاحم

دوسری مثال آسیہ بنت مزاحم کی ہے۔ وہ حضرت موسیٰ کی ہم عصر تھیں۔ وہ غالبًا بنی اسرائیل سے تعلق رکھتی تھیں۔ مصر کے بادشاہ فرعون نے اُن سے نکاح کر کے اُن کو اپنے محل میں

رکھا۔ وہ وقت کے پیغمبر حضرت موسیٰ پر ایمان لائیں اور سچے دل سے خدا پرستانہ زندگی اختیار کرلی۔ آسیہ بنت مزاحم کا تذکرہ قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے:

اور اللہ ایمان والوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے فرعون کی بیوی کی، جب کہ اُس نے کہا کہ اے میرے رب، میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھ کو فرعون اور اُس کے عمل سے بچالے اور مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے (التحریم ۱۱)

آسیہ بنت مزاحم بادشاہِ مصر کی ملکہ تھیں۔ وہ شاہی محل میں رہتی تھیں۔ ہر قسم کا عیش و آرام اُن کو حاصل تھا۔ مگر یہ مادّی کامیابی اُن کو غافل یا سرکش نہ بنا سکی۔ جب حضرت موسیٰ کی دعوت اُنہیں پہنچی تو اپنے کُھلے ذہن کی وجہ سے فوراً اُنہوں نے اُس کو قبول کرلیا اور اپنی زندگی خدا اور پیغمبر کی اطاعت میں گزارنے لگیں۔

فرعون شرک کے مذہب کو اختیار کیے ہوئے تھا جو اُس کے لیے مصر کے قدیم مشرکانہ سماج میں اپنی سیاسی حکمرانی قائم کرنے کے لیے بہت مفید تھا۔ حضرت موسیٰ نے جب مصر میں توحید کی دعوت بُلند کی تو وہ اُن کا دشمن بن گیا اور توحید کی دعوت مٹانے کے درپے ہو گیا۔

فرعون نے آسیہ بنت مزاحم کو دو میں سے ایک کا اختیار (option) دیا — یا تو موسیٰ کے دین کو چھوڑ دو، ورنہ تم کو بغاوت کے جرم میں قتل کر دیا جائے گا۔ موسیٰ کے دین کو چھوڑنا جنت کو چھوڑنے کے ہم معنیٰ تھا، جب کہ فرعون کے حکم کو نہ ماننے سے صرف وقتی طور پر شاہی محل سے محرومی ہو رہی تھی۔ آسیہ بنت مزاحم نے سچّے طالب حق کی حیثیت سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شاہی محل سے محرومی کو گوارا کرلیں مگر وہ خدا کی جنت سے محرومی کو گوارا نہ کریں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسیہ بنت مزاحم کو فرعون کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ آخر وقت میں آسیہ بنت مزاحم کی زبان پر جو دعا تھی وہ اتنی بامعنیٰ تھی کہ قرآن نے اس کو ہمیشہ کے لیے ان الفاظ میں شامل وحی کر دیا ہے: رب ابن لی عندك بیتاً فی الجنة (اے میرے رب، تو میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے)۔

قرآن میں اس دعا کو نقل کرنا گویا خدا کی طرف سے اُس کی قبولیت کا ایک بالواسطہ اعلان ہے۔ آسیہ بنت مزاحم کی زندگی کا یہ جزء ساری خواتین کے لیے (نیز مردوں کے لیے) اس بات کی خوش خبری ہے کہ خدا پرستانہ زندگی اختیار کرنے کے لیے اگر دنیا کی جنت کھوئی جارہی ہو تو اس کی پروانہ کرنا۔ کیوں کہ جو عورت یا مرد خالص خدا کے لیے دنیا کی عارضی جنت کو چھوڑے گا اُس کے لیے خدا آخرت کی ابدی اور معیاری جنت مقدر کردے گا۔ اور بلا شبہہ اس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں۔

مریم والدۂ مسیح

اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ ذکر خاتون مریم ہیں جو حضرت مسیح کی والدہ ہیں۔قرآن میں مریم کا نام ۳۴ بار آیا ہے، جب کہ کسی اور مسلم خاتون کا نام قرآن میں ایک بار بھی نہیں آیا۔اس سے مریم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں مریم کے بارہ میں قرآن کے بیانات کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

جب عمران کی بیوی نے کہا کہ اے میرے رب، میں نے نذر کیا تیرے لیے جو میرے پیٹ میں ہے وہ آزاد رکھا جائے گا۔ پس تو مجھ سے قبول کر بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب اُس نے جنا تو اُس نے کہا کہ اے میرے رب، میں تو لڑکی جَنی ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اُس نے کیا جنا اور لڑکا نہیں ہوتا لڑکی کے مانند۔ اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس اُس کے رب نے اُس کو اچھی طرح قبول کیا اور اس کو عمدہ طریقہ سے پروان چڑھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔ جب کبھی زکریا اُن کے پاس حجرہ میں آتا تو وہاں رزق پاتا۔ اُس نے پوچھا کہ اے مریم، یہ چیز تمہیں کہاں سے ملتی ہے۔ مریم نے کہا کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے۔ (آل عمران ۳۵۔۳۷)

یہ رزق کیا تھا۔ وہ حکمت ومعرفت کا رزق تھا۔ حضرت مریم نے اپنی زندگی کو خدا کے لیے

وقف کر دیا تو خدا نے ان پر حکمت ومعرفت کے خزانوں کے دروازے کھول دیے۔ قرآن میں مزید ارشاد ہوا ہے:

اور جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم، اللہ نے تم کو منتخب کیا اور تم کو پاک کیا اور تم کو دنیا بھر کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب کیا ہے۔ اے مریم، اپنے رب کی فرماں برداری کرو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں اور تم اُن کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور نہ تم اُس وقت ان کے پاس موجود تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم، اللہ تم کو خوش خبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت میں مرتبہ والا ہوگا اور اللہ کے مقرب بندوں میں ہوگا۔ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا جب ماں کی گود میں ہوگا اور جب پوری عمر کا ہوگا۔ اور وہ صالحین میں سے ہوگا۔ مریم نے کہا کہ اے میرے رب، میرے کس طرح لڑکا ہوگا جب کہ کسی مرد نے مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ آل عمران ۴۲۔۴۷۔

اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارہ میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اُس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اُس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ باز آجاؤ، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس ایک اللہ ہی ہے۔ وہ پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کا کارساز ہونا کافی ہے۔ النساء ۱۷۱

اور اسی طرح ارشاد ہوا ہے:

اور کتاب میں مریم کا ذکر کرو جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی مکان میں چلی گئی۔

پھر اُس نے اپنے آپ کو اُن سے پردے میں کرلیا۔ پھر ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو اُس کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ مریم نے کہا، میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے۔ اُس نے کہا، میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ مریم نے کہا، میرے یہاں کیسے لڑکا ہوگا جب کہ مجھ کو کسی آدمی نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار رہوں۔ فرشتے نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے۔ اور تاکہ ہم اُس کو لوگوں کے لیے نشانی بنا دیں اور اپنی جانب سے ایک رحمت اور یہ ایک طے شدہ بات ہے۔ پس مریم نے اس کا حمل اٹھا لیا اور وہ اس کو لے کر ایک دور کی جگہ چلی گئی۔ پھر دردِ زِہ اس کو کھجور کے درخت کی طرف لے گیا۔ اُس نے کہا، کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور بھولی بسری چیز ہو جاتی۔ پھر مریم کو اُس نے اس کے نیچے سے آواز دی کہ غمگین نہ ہو۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے اور تم کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ۔ اس سے تمہارے اوپر پکی کھجوریں گریں گی۔ پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر اگر تم کوئی آدمی دیکھو تو اس سے کہہ دو کہ میں نے رحمٰن کا روزہ مان رکھا ہے تو آج میں کسی انسان سے نہیں بولوں گی۔ پھر وہ اس کو گود میں لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگوں نے کہا، اے مریم، تم نے بڑا طوفان کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تمہارا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی۔ پھر مریم نے اُس کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا، ہم اس سے کس طرح بات کریں جو کہ گود میں بچّہ ہے۔ بچہ بولا، میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھ کو کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا۔ اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اُس نے مجھ کو برکت والا بنایا ہے۔ اور اُس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے جب تک میں زندہ رہوں۔ اور مجھ کو میری ماں کا خدمت گزار بنایا ہے۔ اور مجھ کو سرکش، بدبخت نہیں بنایا ہے۔ اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے

ہیں۔ اللہ ایسا نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ (مریم ۱۶۔ ۳۵)

اسی طرح قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اور ہم نے مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو ایک نشانی بنایا اور ہم نے اُن کو ایک اونچی زمین پر ٹھکانا دیا جو سکون کی جگہ تھی اور وہاں چشمہ جاری تھا۔ المؤمنون ۵۰

اسی طرح فرمایا:

اور عمران کی بیٹی مریم، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کے کلمات کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی۔ التحریم ۱۲

مریم سُریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنٰی بُلند کے ہیں۔ مریم، والدۂ مسیح ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے ساتھ اللہ نے ہر اعتبار سے معجزاتی معاملہ کیا۔ وہ ایک صالح خاتون کی خصوصی دعا کے نتیجہ میں پیدا ہوئیں۔ اُن کی تعلیم و تربیت تمام تر یہودی عبادت گاہ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے وہ ہیکل کی خدمت میں دے دی گئیں۔ جب وہ ہیکل میں تھیں تو اُن کی روحانی زندگی اور اُن کی معرفت کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کی نظر میں وہ ایک انتہائی مقدس خاتون بن گئیں۔ اُن کی پاکیزگی پر شک کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔

ایسی خاتون کو خدا نے مسیح کی ماں بننے کے لیے چُنا، ایک ایسی ماں جس کا کوئی شوہر نہ ہو اور جس کے بچہ کا کوئی والد نہ ہو۔ خدا کے براہِ راست کلمہ کے ذریعہ وہ حاملہ ہوئیں اور مدت کی تکمیل پر ایک کامل اور تندرست بچہ کو جنم دیا۔ مریم جیسی پاک دامن خاتون کے لیے یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا کہ وہ ایک ایسے بچہ کی ماں بنیں جس کا کوئی باپ نہ ہو۔ یہی نزاکت تھی جس کی بنا پر خدا نے اپنا فرشتہ مریم کے پاس بھیجا جو اُنہیں تسلّی دے اور اُنہیں اس موقع پر ذہنی صدمہ سے بچائے۔ اسی کے ساتھ خدا نے اُن کے لیے شہر کے باہر معجزاتی طور پر خوراک اور پانی کا انتظام کیا۔

اس غیر معمولی انتظام کا سبب غالباً وہ مخصوص کردار تھا جو حضرت مسیح کو یہود کے اندر ادا کرنا تھا۔ حضرت مسیح یہود (بنی اسرائیل) کے آخری پیغمبر تھے۔ اُس وقت تک خدا کے پیغمبر بنی اسرائیل کی نسل میں آتے تھے۔ مگر دو ہزار سال پہلے بنی اسرائیل کا بگاڑ اپنی آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔ اللہ کو مقصود تھا کہ وہ حضرت مسیح کی صورت میں آخری اسرائیلی پیغمبر بھیج کر اسرائیل کی معزولی کا اعلان کرے۔ حضرت مسیح کا باپ کے بغیر پیدا ہونا غالباً اس لیے تھا کہ خدا یہود کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ تمہارا بگاڑ اتنا زیادہ عام ہو چکا ہے کہ تمہارے اندر اب ایک مرد بھی ایسا نہیں جو مقدس پیغمبر کا باپ بننے کے قابل ہو۔ غالباً اسی حقیقت کے اظہار کے لیے حضرت مسیح کو باپ کے بغیر صرف ماں کے بطن سے پیدا کیا گیا۔

یہود اچھی طرح جانتے تھے کہ مریم کی پوری زندگی ہیکل (معبد) میں لوگوں کے سامنے گذری ہے۔ وہ بلا شک وشبہہ ایک پاکیزہ خاتون ہیں۔ اس کے باوجود اُن کے اخلاقی بگاڑ کا یہ نتیجہ تھا کہ مسیح جب باپ کے بغیر مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تو اُنہوں نے مریم پر الزام عائد کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ: **لقد جئت شیئاً فریّا (مریم ۲۷)**

اللہ تعالیٰ نے مزید یہ اہتمام فرمایا کہ یہود حضرت مسیح کے بارہ میں بلا شک وشبہہ یہ یقین کر سکیں کہ وہ کلمۂ خداوندی سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ کہ وہ ایک پیغمبر ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایسا ہوا کہ حضرت مسیح پیدائش کے بعد جب ایک چھوٹے بچہ کی صورت میں حضرت مریم کی گود میں تھے اُس وقت اُنہوں نے بالکل صاف الفاظ میں یہود سے کلام کیا اور اُنہیں بتایا کہ میں براہ راست خدا کے کلمہ سے پیدا ہوا ہوں۔ میں تمہارے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ مجھے تمہارے درمیان خدا کے مقرر کیے ہوئے مشن کو پورا کرنا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ حضرت مسیح کو بے حد غیر معمولی قسم کے معجزے دیے گئے۔ قرآن میں ان معجزات یا نشانیوں کا ذکر اس طرح آیا ہے:

اور مسیح ایک رسول ہوں گے بنی اسرائیل کی طرف کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندہ کی مانند صورت بناتا ہوں، پھر اس میں

پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے
مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتا ہوں۔
اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہو۔ بے شک
اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ آل عمران ۴۹

مریم کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ انہوں نے پاکیزہ زندگی اختیار کی تو خدا نے اپنی روح سے ان کی مدد کی۔ یہ ایک تاریخی مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ کوئی عورت یا مرد اگر مکمل معنیٰ میں پاکیزگی کا ثبوت دے تو وہ خدا کے خصوصی انعام کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ انعام مریم کو ایک خاص صورت میں ملا۔ دوسروں کو یہ انعام ان کے اپنے حالات کے لحاظ سے دیا جائے گا۔

خدیجہ بنت خویلد

خدیجہ بنت خویلد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی اہلیہ تھیں۔ وہ مکہ کے قبیلۂ قریش کے ایک معزّز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اُن کی عمر پیغمبر اسلام سے پندرہ سال زیادہ تھی۔ خدیجہ کا پہلا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ سے ہوا۔ ابو ہالہ مکہ کے ایک کامیاب تاجر تھے۔ وہ نکاح کے جلد ہی بعد مر گئے۔ اس کے بعد اُن کی تمام دولت خدیجہ کے حصہ میں آئی۔ خدیجہ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا۔ وہ بھی ایک دولتمند تاجر تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسرے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اُن کی دولت خدیجہ کے حصہ میں آئی۔ اس طرح خدیجہ عرب کی ایک دولت مند خاتون بن گئیں۔

خدیجہ نہایت باصلاحیت خاتون تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد اُنہوں نے خود بھی تجارت شروع کی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ تجارتی مال اونٹوں پر لاد کر شام کے ملک میں بھیجتیں۔ یہ سامان وہاں فروخت کر دیا جاتا اور پھر وہاں سے دوسرا سامان اونٹوں پر لاد کر آتا جو مکہ کے بازار میں فروخت کیا جاتا۔ یہ تجارت وہ اس طرح کرتی تھیں کہ اپنے غلام میسرہ کے ساتھ ایک اور تجربہ کار شخص کو اونٹوں کے ساتھ بھیج دیتیں۔ واپسی کے بعد اس شخص کو معاوضہ میں ایک اونٹ دے دیتیں۔

اُس زمانہ میں محمد بن عبد اللہ ﷺ ایک امانت دار انسان کی حیثیت سے مکہ میں مشہور ہو چکے

تھے۔ایک روایت کے مطابق، آپ کے چچا ابوطالب کی درخواست پر خدیجہ نے اپنے تجارتی سفر کا ذمہ دار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا اور اُنہیں اپنے تجارتی اونٹوں کے ساتھ شام بھیجا۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب واپس آئے تو خدیجہ کو معلوم ہوا کہ اُن کے تجارتی سفر میں پہلے سے زیادہ نفع حاصل ہوا ہے۔ خدیجہ خوش ہوگئیں۔اُنہوں نے معاوضہ کو دُگنا کرتے ہوئے آپ کو دو اُونٹ دیئے۔

ان تجارتی سفروں میں خدیجہ کا غلام میسرہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا تھا۔میسرہ نے آپ کے اخلاق اور حُسنِ تدبیر کے بارہ میں خدیجہ کو بتایا۔نیز خدیجہ کو خود بھی آپ کے بارہ میں اچھے تجربات ہوئے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدیجہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ آپ کو اپنا رفیق حیات بنائیں۔روایات کے مطابق، خدیجہ نے مکہ کی ایک معمّر خاتون کے ذریعہ آپ کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔آپ نے اپنے چچا سے مشورہ کے بعد اُس کو قبول کرلیا۔چنانچہ آپ کا نکاح خدیجہ کے ساتھ ہوگیا۔اس تقریب میں دونوں طرف کے اہل خاندان شریک ہوئے۔نکاح کے وقت خدیجہ کی عمر چالیس سال اور پیغمبر اسلام کی عمر پچیس سال تھی۔

خدیجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح نبوت سے تقریباً پندرہ سال پہلے ہوا تھا۔ ان پندرہ سالوں میں خدیجہ کو آپ کی سیرت کے بارے میں قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کا موقع ملا۔وہ یقین کے درجہ میں سمجھ چکی تھیں کہ محمد بن عبداللہ ہر اعتبار سے ایک کامل انسان ہیں۔اُس زمانہ میں پیغمبر اسلام ایک متلاشیٔ حق تھے۔ اس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے:

ووجدك ضالاً فهدىٰ (الضحیٰ ٧)

اس زمانہ میں آپ کا معمول تھا کہ آپ مکہ کے قریب حرا پہاڑ کے ایک غار میں چلے جاتے اور وہاں ذکر وفکر میں مشغول ہوجاتے۔ایک دن ایسا ہوا کہ آپ غارِحرا سے واپس آئے تو آپ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔آپ نے گھر میں داخل ہوکر اپنی اہلیہ خدیجہ سے کہا: **زملونی، زملونی** (مجھے کمبل اوڑھاؤ، مجھے کمبل اوڑھاؤ) اسی واقعہ کی طرف قرآن کی ایک ابتدائی سورہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: **يا ايها المزّمل ، قم الليل الا قليلاً** (المزمل ٢)

خدیجہ نے آپ کی یہ حالت دیکھ کر اس کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ آج غارِ حرا میں میرے ساتھ ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد آپ نے وہ تجربہ بتایا جو فرشتہ جبرئیل کی آمد کے وقت پیش آیا تھا جب کہ وہ پہلی وحی **اقرأ باسم ربک الذی خلق** (العلق ۱) لے کر آپ کے پاس آئے۔ اُس وقت خدیجہ نے آپ کو تسلی دی اور آپ کے بارہ میں وہ تاریخی الفاظ کہے جو سیرت کی کتابوں میں اس طرح نقل ہوئے ہیں:

فقالت خديجة: كلّا والله ما يخزيك الله ابدا، انّك لتصل الرحم، وتحمل الكلّ، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف، وتعين على نوائب الحق۔

خدیجہ نے کہا کہ ہرگز نہیں، بخدا، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کا حق ادا کرتے ہیں اور لوگوں کے بوجھ کو اُٹھاتے ہیں اور مفلس کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے معاملہ میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی (رقم الحدیث ۳)

پیغمبر اسلام ﷺ کو نبوت ۶۱۰ء میں ملی۔ یہ زمانہ مذہبی عدم رواداری کا زمانہ تھا۔ اُس زمانہ میں مذہبی آزادی کا وجود نہ تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا تو اُس وقت اُنہیں مشرکین کی طرف سے سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس وقت خدیجہ پورے معنوں میں آپ کی رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں۔ وہ فوراً ہی آپ کی نبوت پر ایمان لائیں اور آپ کے مشن کے سلسلہ میں آپ کی کامل مددگار بن گئیں۔ اُن کی مدد اور رفاقت کے سلسلہ میں کئی مؤثر واقعات سیرت اور حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی آئی اور ایک نئے تجربہ کی بنا پر آپ اُس پر گھبرا اُٹھے، اُس وقت خدیجہ نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اُس وقت مکہ میں ایک عالم رہتے تھے۔ اُن کا نام ورقہ بن نوفل تھا۔ جاہلیت کے زمانہ میں اُنہوں نے بائبل کا مطالعہ کیا تھا اور اُنہوں نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ خدیجہ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے

پاس گئیں جو آپ کے رشتہ دار بھی تھے۔ خدیجہ نے ان کو آپ کا حال بتایا۔ ورقہ بن نوفل نے آپ کی کیفیت اور آپ کے پاس جبرئیل کی آمد کا واقعہ سنا اور پھر کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ورقہ کی جان ہے، اے خدیجہ، تم نے جو کچھ بتایا اگر وہ سچ ہے تو محمد کے پاس وہی عظیم فرشتہ آیا ہے جو موسیٰ کے پاس آتا تھا۔ اور محمد بلاشبہہ اس امت کے پیغمبر ہیں۔

سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۵۶

نبوت کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا وقت توحید کے مشن میں صرف ہونے لگا۔ تجارت بھی چھوٹ گئی۔ اس کے بعد آپ کی پوری کفالت، نیز مشن کے سلسلہ میں سارے اخراجات کی ذمہ دار خدیجہ بن گئیں۔ اُنھوں نے اپنی پوری دولت آپ کے لیے اور آپ کے مشن کے لیے وقف کردی۔ قرآن کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

ووجدك عائلاً فاغنیٰ (الضحیٰ ۸)

اُس زمانہ میں مکہ میں بُت پرستی کا رواج تھا۔ مکہ کے لوگ شرک میں مُبتلا تھے۔ ایسی حالت میں پیغمبر اسلام کی دعوتِ توحید لوگوں کو سخت ناگوار ہوتی تھی۔ اُنھوں نے آپ کو طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔ وہ آپ کے راستہ میں رکاوٹیں ڈال دیتے۔ آپ کے گھر کے پاس آکر شور کرتے۔ ان تمام مصیبتوں میں خدیجہ پورے صبر اور خوش دلی کے ساتھ شریک رہیں۔ انہی حالات میں ایک بار ایسا ہوا کہ فرشتہ جبرئیل پیغمبر اسلام کے پاس آیا۔ اُس نے کہا کہ میری طرف سے اور میرے رب کی طرف سے خدیجہ کو آپ سلام پہنچا دیں اور اُن کو یہ خوش خبری دے دیں کہ اُن کے لیے جنت میں یاقوت کا ایک گھر ہوگا جس میں نہ شور ہوگا اور نہ تکلیف:

اتی جبریل النبی صلی الله علیه وسلم فقال: یا رسول الله هذه خدیجة قد أتت معها اناء فیه ادام او طعام او شراب فاذا هی اتتک فاقرأ علیها السلام من ربّها و منّی وبشّرها ببیت فی الجنة من قصب لاصخب فیه ولانصب۔

صحیح البخاری، کتاب مناقب الانصار، باب تزویج النبی ﷺ خدیجة و فضلها رضی الله عنها

مکی دور کے آخری زمانہ میں مکہ کے مشرک سرداروں نے آپ کے خلاف ایک بے حد سنگین فیصلہ کیا۔ اُنہوں نے متفقہ طور پر ایک صحیفہ تیار کیا جس کو کعبہ کے اندر آویزاں کیا گیا۔ اس صحیفہ میں لکھا گیا تھا کہ مکہ میں کوئی شخص محمد اور ان کے خاندان کے ساتھ خرید وفروخت نہیں کرے گا۔ اُن کے ساتھ نکاح یا قرابت کا معاملہ نہیں کرے گا، وغیرہ۔ یہ صحیفہ دراصل مقاطعہ (بائیکاٹ) کا فیصلہ تھا۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام مجبور ہو کر مکہ کے قریب ایک پہاڑی گھاٹی میں چلے گئے جس کو شعب ابی طالب کہا جاتا تھا۔ اس بائیکاٹ میں خدیجہ بھی اُن کے ساتھ شریک تھیں۔

شعب ابی طالب کی یہ زندگی بے حد تکلیف کی زندگی تھی۔ وہاں نہ آرام تھا اور نہ کھانے پینے کا سامان۔ حتیٰ کہ درخت کی جڑیں اور پتیاں کھانے کی نوبت آ گئی۔ مکہ کے بعض رحم دل حضرات رات کے اندھیرے میں کچھ کھانے کا سامان کبھی پہنچا دیتے۔ مگر وہ بالکل کافی نہ تھا۔ چنانچہ خدیجہ سخت بیمار ہو گئیں۔ اُن کا رنگ کالا پڑ گیا۔ وہ نہایت صبر کے ساتھ اُس تکلیف کو جھیلتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت سے تین سال پہلے مکہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، الجزء الثانی، صفحہ ۲۸۹۔۲۹۶

اُم سلمہ بنت ابو اُمیہ

اُم سلمہ مکہ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے پہلے شوہر کا نام ابوسلمہ تھا۔ دونوں نے مکّی دور میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ مکہ میں جب مخالفین کی طرف سے مصائب بڑھے تو دونوں ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ بعد کو دونوں نے دوبارہ ہجرت کی اور مدینہ آ گئے۔

ام سلمہ کے پہلے شوہر ابوسلمہ بدر اور احد کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ وہ اس جنگ میں زخمی ہو گئے۔ اُن کا زخم پہلے علاج کے بعد اچھا ہو گیا تھا اور پھر دوبارہ لوٹ آیا۔ ۴ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

ام سلمہ کہتی ہیں کہ ایک بار میرے شوہر ابوسلمہ گھر میں آئے اور کہا کہ آج میں رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث سُن کر آیا ہوں جو میرے نزدیک دنیا اور مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔ وہ یہ کہ جس شخص کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ انا لِلّٰہ پڑھے اور اس کے بعد یہ دعا مانگے کہ اے اللہ، میں تجھ سے اپنی اس

مصیبت میں اَجر کی امید رکھتا ہوں۔ اے اللہ، تو مجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرما:

اللهم عندك احتسب مصيبتى هٰذه اللّٰهم اخلفنى فيها بخير منها

سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، الجامع للترمذی، کتاب الدعوات

احمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ ام سلمہ کو اپنے شوہر ابوسلمہ سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ ایک بار ام سلمہ نے اپنے شوہر ابوسلمہ سے کہا: میں نے سنا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر جنتی ہو اور عورت اس کے بعد دوسرا نکاح نہ کرے تو اللہ اس عورت کو بھی شوہر کے ساتھ جنت میں جگہ دیتا ہے۔ یہی صورت مرد کے لیے ہے۔ تو آؤ ہم تم معاہدہ کرلیں۔ نہ تم ہمارے بعد نکاح کرو، نہ میں تمہارے بعد نکاح کروں، ابوسلمہ نے جواب دیا۔ کیا تم میری اطاعت کروگی۔ ام سلمہ نے کہا کہ سوائے تمہاری اطاعت کے مجھے کس بات میں خوشی ہوسکتی ہے۔ ابوسلمہ نے کہا: جب میں مرجاؤں تو میرے بعد تم نکاح کرلینا۔ پھر ابوسلمہ نے دعا مانگی۔ یا اللہ، میرے بعد ام سلمہ کو مجھ سے بہتر ساتھی عطا فرما۔ ام سلمہ فرماتی ہیں کہ جب ابوسلمہ مرگئے تو میں اپنے دل میں کہتی تھی کہ ابوسلمہ سے بہتر کون ہوگا۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد رسول اللہ ﷺ سے میرا نکاح ہوگیا۔

رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے وقت ام سلمہ کو دو چکیاں، دو مشکیزے، ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی عنایت فرمایا۔ یہی سامان آپ نے دوسری بیویوں کو بھی دیا تھا۔

ام سلمہ قریش کے ایک سردار کی بیٹی تھیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کی پوری زندگی سادگی اور قناعت کی زندگی بن گئی۔ ام سلمہ نے جو حدیثیں روایت کی ہیں ان کی تعداد ۳۷۸ ہے۔ اُن کو رسول اللہ ﷺ کا کلام سننے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن وہ حجرہ کے اندر اپنا بال درست کرا رہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی آواز سنتے ہی آپ فوراً بال کو اسی حال میں باندھ کر کھڑی ہوگئیں اور قریب ہوکر پورا خطبہ سنا۔

ام سلمہ قرآن کی تلاوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز پر کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح قرآن پڑھتے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ ایک ایک آیت

الگ الگ کر کے پڑھتے تھے۔اس کے بعد خود اسی طرح پڑھ کر بتایا۔

ام سلمہ ایک ذہین خاتون تھیں۔ وہ بہت جلد معاملہ کی گہرائی تک پہنچ جاتی تھیں۔صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے مشرکین کے اصرار پر مکہ جا کر عمرہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور حدیبیہ ہی سے واپس مدینہ آ گئے۔آپ اور آپ کے اصحاب قربانی کے اونٹ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔آپ نے فیصلہ کیا کہ ان جانوروں کو حدیبیہ کے مقام پر ہی ذبح کر دیا جائے۔اس سلسلہ میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے ام سلمہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ واقعہ البخاری کی روایت کے مطابق یہ تھا:

رسول اللہ ﷺ جب معاہدہ حدیبیہ کی کتابت سے فارغ ہوئے تو آپ نے اپنے اصحاب سے کہا کہ اٹھو اور قربانی کے جانور کو یہیں (حدیبیہ میں) ذبح کردو اور اپنے سر کا حلق کرا لو۔ راوی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، ان میں سے کوئی بھی شخص نہ اُٹھا۔ یہاں تک کہ آپ نے تین بار فرمایا۔ پھر جب ان میں سے کوئی نہ اُٹھا تو آپ ام سلمہ کے پاس آئے جو اُس وقت خیمے کے اندر تھیں۔آپ نے ان سے وہ بات بتائی جو لوگوں کی طرف سے آپ کو پیش آئی تھی۔ ام سلمہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو آپ جایئے اور کسی سے کوئی بات نہ کیجئے۔ یہاں تک کہ آپ اپنی قربانی کے جانور کو ذبح کر دیں اور اپنے حالق کو بلائیں اور اس سے اپنا سر مونڈا لیں۔ چنانچہ آپ نکلے۔آپ نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ یہاں تک کہ آپ نے ایسا ہی کیا۔آپ نے اپنی قربانی کے جانور کو ذبح کر دیا اور اپنے حالق کو بلا کر اپنا سر مونڈا لیا۔ پھر جب لوگوں نے اس کو دیکھا تو وہ بھی اُٹھے اور انہوں نے اپنے جانور کو ذبح کیا اور ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگے۔لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غم کی وجہ سے ایک دوسرے کو کاٹ ڈالیں گے۔(صحیح البخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب، وکتابۃ الشروط (رقم ۲۷۳۱، ۲۷۳۲) فتح الباری لابن حجر العسقلانی، جلد ۵، صفحہ ۳۸۸، ۳۸۹)

اوپر کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہ نہایت زیرک خاتون تھیں۔اسی کے ساتھ

اُن کا دینی ذوق بہت بُلند تھا۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ حقیقی معنوں میں پیغمبر اسلام کی رفیقۂ حیات بن سکیں۔ مذکورہ قسم کا واقعہ کسی کی زندگی میں اچانک پیش نہیں آ سکتا۔ ایسا کوئی واقعہ صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ کسی عورت یا مرد نے اپنے آپ کو اسلام کے مِشن میں پوری طرح شامل کرلیا ہو۔

تاریخ میں جو اعلیٰ خواتین گزری ہیں اور جن کو نمونہ کی خواتین کہا جاسکتا ہے، اُن میں سے چند خواتین کا مختصر تذکرہ اوپر کیا گیا۔ ان میں سے ہر خاتون کی زندگی مختلف حالات میں گزری۔ اس اعتبار سے ہر ایک کی زندگی میں مختلف قسم کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر خاتون نے اپنے حالات میں سچائی پر عمل کیا۔ ان میں سے ہر خاتون کو ماڈل خاتون کہا جاسکتا ہے۔

عورت کا کردار

قرآن کے بیان کے مطابق، حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل کو جو احکام دیے گئے ان میں سے ایک حکم وہ تھا جو قرآن میں اس طرح مذکور ہوا ہے: اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر مقرر کرلو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔ اور اہلِ ایمان کو خوش خبری دے دو۔ (یونس ۸۷)

قبلہ کے معنیٰ عربی زبان میں مرجع یا مرکزِ توجہ کے ہیں۔ یہاں گھروں کو قبلہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی بستیوں میں کچھ گھروں یا ان گھروں کے بعض مناسب حصوں کو اس مقصد کے لیے مخصوص کر دیا جائے کہ وہ حضرت موسیٰ کی دینی جدوجہد کے لیے مرکز کے طور پر کام دیں۔ یہاں تنظیمی اجتماعات ہوں، باہمی مشورے ہوں، دعوتی عمل کی خاموش منصوبہ بندی کی جائے اور لوگوں کی دینی تربیت کی جائے۔

گھر کو قبلہ بنانے کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، گھر کو ایک ادارہ (institution) کا درجہ دینا ہے۔ اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ مسلم آبادی کا ہر گھر یا کم از کم کچھ گھر ایسا ہونا چاہیے جو معروف معنوں میں صرف گھر نہ ہو بلکہ وہ ایک دینی ادارہ بن جائے۔ وہ دینی ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے مرکز کا کام دینے لگے۔

گھر کو ادارہ کا درجہ دے کر اُس کو مرکز بنانا اپنے آپ عورت کے کردار کو متعین کر دیتا ہے۔ گھر کا تصور عورت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جب ایک گھر دینی اور دعوتی مرکز کا درجہ حاصل کرلے تو اُس کے نظام میں عورت کو اپنے آپ ایک مرکزی مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اس تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کے وسیع تر کردار کے بارہ میں پیغمبرانہ مذہب کا نقطۂ نظر کیا ہے۔

یہی بات قرآن میں ازواجِ رسول کے حوالے سے کہی گئی ہے۔ چنانچہ ازواجِ رسول کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **واذکرن ما یُتلیٰ فی بیوتکن من اٰیٰت اللّٰہ والحکمۃ ان اللّٰہ**

کان لطیفاً خبیرا (اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا تذکرہ کرو۔ بے شک اللہ باریک بین ہے، خبر رکھنے والا ہے) الاحزاب ۳۴۔

قرآن کی اس آیت میں ازواجِ رسول کی ایک ذمہ داری کو بتایا گیا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے ذریعہ ان کو قرآن کی جو تعلیمات مل رہی ہیں اور حکمت کی جو باتیں وہ سُن رہی ہیں اُن کو وہ دوسروں تک پہنچائیں۔ وہ ان باتوں کا چرچا کریں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ازواجِ رسول کے گھر کو ایک تعلیمی ادارہ یا ایک دعوتی مرکز کے طور پر کام کرنا چاہیے۔

یہ بات صرف ازواجِ رسول کے گھر کے بارہ میں نہیں بلکہ وہ ہر مسلمان کے گھر کے بارہ میں ہے۔ ازواجِ رسول کے گھر کو اس معاملہ میں گویا ماڈل کا درجہ حاصل ہے۔ ازواجِ رسول کی حیثیت امہات المومنین بالفاظ دیگر معلمات المسلمین کی ہے۔ اُن کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ پیغمبر کے قریب رہ کر جو کچھ سیکھیں اُس کو بقیہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ اور پھر یہ سلسلہ امت میں برابر جاری رہے۔ دور اول میں ازواج رسول کے گھر کو بھی یہ حیثیت حاصل تھی اور اصحاب رسول کے گھر کو بھی۔ یہاں اس قسم کی دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تین آدمی ازواجِ رسول کے گھر پر آئے۔ اُنھوں نے ازواجِ رسول سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارہ میں پوچھا۔ پھر جب اُنہیں اس کے بارہ میں بتایا گیا تو گویا کہ اُنھوں نے اس کو کم سمجھا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ۔ اللہ نے آپ کی اگلی اور پچھلی خطاؤں کی مغفرت کر دی ہے۔ اُن میں سے ایک نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ دن میں روزہ رکھوں گا اور اس کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ اور تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے دور رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے (آپ کو یہ بات معلوم ہوئی) تو آپ نے کہا کہ کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنھوں نے ایسا اور ایسا کہا ہے۔ تو سن لو کہ خدا کی قسم، میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور زیادہ متقی ہوں۔ لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور روزہ نہیں بھی رکھتا۔ اور

میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ (یہ میرا طریقہ ہے) اور جو میرے طریقہ کو پسند نہ کرے وہ مجھ سے نہیں۔ (صحیح البخاری کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، رقم الحدیث ۵۰۶۳)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ازواجِ رسول کا گھر عمومی تعلیم اور دعوت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لوگ وہاں آکر اسلام کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ تعلیم و دعوت کا یہ سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی قائم تھا اور آپ کی وفات کے بعد بھی برابر جاری رہا۔ یہ نمونہ جو ابتدائی دور میں ازواجِ رسول کے ذریعہ قائم کیا گیا، وہی اہلِ اسلام سے ہمیشہ کے لیے اور ہر دور میں مطلوب ہے۔

ام الدرداء

ابوالدرداء ایک مشہور صحابی ہیں۔ ان کی وفات کے بعد عون بن عبداللہ بن عتبہ اُن کی زوجہ ام الدرداء کے پاس آئے۔ اُنھوں نے ابوالدرداء کی زوجہ سے پوچھا کہ ابوالدرداء کا افضل عمل کیا تھا (**ماکان افضل عمل ابی الدرداء**) دوسری روایت میں ہے کہ اُنھوں نے پوچھا کہ ابوالدرداء کثرت سے کون سا عمل کرتے تھے (**ما کان اکثر عمل ابی الدرداء**) اس کے جواب میں اُن کی زوجہ ام الدرداء نے کہا کہ سوچنا اور عبرت پکڑنا (**التفکر والاعتبار**)

حلیۃ الأولیاء، بحوالہ حیاۃ الصحابہ محمد یوسف کاندھلوی، الجزء ۲، صفحہ ۶۲۷

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی زوجہ کے بیان کے مطابق، اُن کی خاص عبادت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سوچتے رہتے تھے اور چیزوں سے عبرت پکڑتے تھے۔ اس عبرت پذیری کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بار اُن کے سامنے ایک بیل گاڑی گذری۔ اس کو دو بیل کھینچ رہے تھے۔ درمیان میں ایک بیل بیٹھ گیا اور ایک بیل کھڑا رہا۔ اس پر گاڑی والے نے بیٹھنے والے بیل کو مارا۔ اس کو دیکھ کر ابوالدرداء نے کہا کہ: **ان فی هذا لمعتبرا**۔ بے شک اس واقعہ میں ایک نصیحت ہے۔ (صفحہ ۶۲۷)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبرت پذیری کیا ہے۔ وہ ہے دنیا کے واقعہ سے آخرت کا سبق لینا۔ ابوالدرداء کے سامنے بیل کے بیٹھنے کا جو واقعہ ہوا وہ ایک دنیوی واقعہ تھا۔ مگر اس دنیوی واقعہ

سے انھوں نے ایک اخروی سبق نکالا۔ وہ یہ کہ جس طرح دنیا میں ڈیوٹی نہ کرنے پر سزا ملتی ہے، اسی طرح آخرت میں ان لوگوں کو خدا کی طرف سے سزا دی جائے گی جنہوں نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی۔

اس طرح اسلام کی پوری تاریخ میں اہلِ ایمان کا گھر مسلسل طور پر دعوت وتعلیم کا مرکز بنا رہا۔ خواتین فطری طور پر اس مرکز میں بنیادی کردار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پیغمبر اسلام کے بعد اسلامی تاریخ کا تسلسل زیادہ تر دو اداروں کے ذریعہ قائم رہا ہے—— داخلی اعتبار سے گھر، اور خارجی اعتبار سے مسجد۔

رابعہ بصری

رابعہ بصری ایک معروف مسلم خاتون ہیں۔ اُن کے بارہ میں بہت سے عجیب وغریب واقعات کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔ اُن کے بارہ میں غالباً کوئی تحقیقی کتاب موجود نہیں۔ تاہم حسب ذیل کتابوں میں ان کے حالات دیکھے جاسکتے ہیں۔

ابونعیم	حلیۃ الأولیاء
ابن الجوزی	صفوۃ الصفوۃ
شہاب الدین سہروردی	عوارف المعارف
ابن کثیر	البدایۃ والنہایہ
خیرالدین الزرکلی	الأعلام

ابوداؤد السجستانی نے رابعہ بصری پر زندقہ کا الزام لگایا ہے۔ مگر بظاہر یہ انتہا پسندی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ رابعہ بصری بلا شبہ ایک عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں۔ وہ صوفیا کے طریقہ کے مطابق، اکثر دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو نماز پڑھتیں۔ اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے اُنھوں نے شادی نہیں کی۔ اگرچہ کئی لوگوں نے ان کو شادی کا پیغام دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان پیغام دینے والوں میں حسن بصری بھی شامل تھے۔

رابعہ بصری کا پورا نام اس طرح تھا: رابعہ بنت اسماعیل العدویۃ، ام الخیر- اُن کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارہ میں اختلاف ہے۔ معروف روایت کے مطابق، وہ ۷۱۸ء میں بصرہ میں پیدا ہوئیں اور ۸۰۱ء میں بصرہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک اور روایت کے مطابق، ان کی وفات قدس میں ہوئی۔

رابعہ بصری کے حالات میں اکثر طلسماتی واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو درست معلوم نہیں ہوتے۔ مختصر یہ کہ رابعہ بصری ابتدائی دور کے صوفیا میں سے سمجھی جاتی ہیں۔ وہ دنیوی زندگی سے الگ ہوگئی تھیں اور زیادہ تر عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ وہ بصرہ کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئیں۔

رابعہ بصری کے والدین بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تین بہنوں کی بھی جلد ہی وفات ہوگئی۔ اُن کی زندگی بڑی عسرت میں گذری۔ آخر کار وہ بصرہ میں ایک حجرہ کے اندر رہنے لگیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک نامور صوفی سفیان ثوری رابعہ سے ملنے آئے اور اُنھوں نے ہاتھ اُٹھا کر دنیا کی بھلائی کے لیے دعا مانگی۔ اس پر رابعہ بصری رونے لگیں۔ جب اُن سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو اُنھوں نے کہا کہ: ''حقیقی خوشی اور بھلائی تو دنیا سے کنارہ کشی سے حاصل ہوتی ہے اور آپ اسی دنیا میں بھلائی چاہتے ہیں۔''

وہ جسمانی تکلیفوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتی تھیں۔ کوئی تکلیف اُنہیں خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں خدا کی عبادت کسی جزا یا انعام کی خاطر نہیں کرتی ہوں اور نہ دوزخ کے خوف یا جنت کی خواہش سے کرتی ہوں۔ ایک دوسرے موقع پر ایک سوال کے جواب میں کہ کیا آپ شیطان سے نفرت کرتی ہیں، رابعہ بصری نے کہا کہ نہیں، خدا کی محبت نے میرے لیے اتنی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ میں شیطان سے یا کسی سے نفرت کروں۔

رابعہ بصری شعر بھی کہتی تھیں۔ اُن کے بہت سے عربی اشعار کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔ اُن کے اقوال میں صوفیانہ مزاج پایا جاتا ہے۔ اُن کا ایک قول یہ ہے: اکتموا حسناتکم کما

تکتمون سیئاتکم۔ یعنی تم اپنی نیکیوں کو چھپاؤ، جس طرح تم اپنی برائیوں کو چھپاتے ہو۔

الأعلام للزرکلی، بیروت ۱۹۸۶ء، الجزء ۳، صفحہ ۱۰۔

رابعہ بصری سے اکثر لوگ دینی اور روحانی فیض کے لئے ملتے تھے اور وہ ان کو مذکورہ قسم کی تعلیم دیتی رہتی تھیں۔ وہ اپنے ماحول میں لوگوں کے لئے معلم اور مربی بنی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے قول و عمل سے متاثر کیا۔

رابعہ بصری اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں جس کو تابعین کا زمانہ کہا جاتا ہے، یعنی ان لوگوں کا زمانہ جنھوں نے اصحابِ رسول کو دیکھا تھا۔ مگر میں نے کتابوں میں ایسا کوئی واقعہ نہیں پڑھا جس میں بتایا گیا ہو کہ ان کی ملاقات فلاں صحابی سے ہوئی تھی۔ بہرحال زمانی اعتبار سے اُن کو تابعی کہا جا سکتا ہے۔

رابعہ بصری اور مشہور تابعی حسن بصری (وفات ۱۱۰ھ) دونوں ہم عصر ہیں۔ دونوں کے بارہ میں کسی حد تک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اپنے زمانہ میں روحِ اسلام کا احیاء چاہنے والے لوگ تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ بعد کے دور کے مسلمانوں میں روحِ اسلام کا زوال ہوا۔ اسلام کے مظاہر تو کثرت سے موجود تھے مگر اسلام کی روح بہت مضمحل ہوگئی تھی۔ اُس وقت جو لوگ روحِ اسلام کو زندہ کرنے کے لیے اُٹھے ان میں سے ایک رابعہ بصری بھی تھیں۔

حسن بصری کا درجہ علمی اعتبار سے رابعہ بصری سے بُلند ہے۔ تاہم نوعیت کے اعتبار سے دونوں ایک زمرہ میں آتے ہیں۔ حسن بصری کے زمانہ میں عمر بن عبدالعزیز خلیفہ منتخب ہوئے۔ اُنھوں نے حسن بصری کو خط لکھا کہ مجھے خلافت کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ ایسے افراد بتائیے جو اس کام میں میری مدد کریں۔ اس کے جواب میں حسن بصری نے اُنھیں لکھا: **أما ابناء الدنیا فلا تریدھم، واما ابناء الآخرۃ فلا یریدونك، فاستعن باللّٰہ**۔ یعنی جو دنیا پرست ہیں اُن کو آپ نہیں چاہیں گے اور جو آخرت پسند ہیں وہ آپ کو نہیں چاہیں گے۔ پس آپ اللہ سے مدد مانگیے۔

الأعلام للزرکلی، ۱۹۸۶ء، الجزء ۳، صفحہ ۲۲۶

راقم الحروف کے نزدیک حسن بصری کا یہ جواب ایک غلو کا جواب تھا۔ عمر بن عبد العزیز ایک خلیفۂ راشد تھے۔ حسن بصری کو چاہیے تھا کہ وہ اُن کے ساتھ تعاون کریں۔ یہی معاملہ رابعہ بصری کا بھی تھا۔ وقت کے کئی بڑے لوگوں نے ان کی طرف رجوع کیا۔ مگر استغنا کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اُن سے دور رہیں۔

رابعہ بصری (اور اُس زمانہ کے دوسرے صوفیا) کے یہاں اگر چہ غلو تھا۔ مگر اُنھوں نے ایک کام کیا۔ اُنھوں نے ظاہر پسندی اور مادہ پرستی کی حوصلہ شکنی کی۔ اُنھوں نے اُس وقت روحِ اسلام کو زندہ کرنے کی کوشش کی جب کہ اُس پر عمومی اضمحلال آ چکا تھا۔

تاتاری دور کی خواتین کا کارنامہ

اسلام کی تاریخ ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ پانچ صدیوں تک شاندار سفر کرنے کے بعد تیرہویں صدی میں ایک زبردست حادثہ پیش آیا۔ تاتاری قبائل بیس ہزار کی تعداد میں اپنے کوہستانی علاقوں سے نکلے۔ اُنھوں نے سمرقند سے لے کر حلب تک پوری مسلم سلطنت کو تاراج کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۲۵۸ میں عباسی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد نصف صدی کے اندر یہ معجزاتی واقعہ ہوا کہ تاتاری فاتحین کی اکثریت نے دین اسلام قبول کر لیا اور وہ انوکھا واقعہ پیش آیا جس کو پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (T.W.Arnold) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فاتحین نے مفتوح کے مذہب کو اختیار کر لیا:

> The conquerors have accepted the religion of the conqured.
> The Preaching of Islam by T.W. Arnold, Feroz sons Ltd, Lahore, 1979, p.2

پروفیسر آرنلڈ نے اس معاملہ میں کافی تحقیق کی ہے کہ ان فاتحین نے کس طرح اسلام قبول کیا۔ اپنی ۵۰۸ صفحہ کی کتاب (دی پریچنگ آف اسلام) میں اُنھوں نے اس سلسلہ میں مختلف اسباب اور واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ غالباً پروفیسر آرنلڈ کی یہ کتاب پہلی کتاب ہے جس میں ان تاتاری فاتحین کے قبولِ اسلام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر مسلم علماء اور مورخین

نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے مگر محض ضمنی طور پر۔ مثلاً اقبال نے لکھا ہے:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے   پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

مگر اقبال یا کسی اور مسلم شخصیت نے اس کی تفصیل نہیں بتائی کہ ایسا کیوں کر ہوا۔ ٹی ڈبلیو آرنلڈ، جو ۱۸۹۶ کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر تھے، انھوں نے اسی دور میں یہ کتاب لکھی۔

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب میں فاتح تاتاریوں کے قبول اسلام کے جو اسباب بتائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تاتاریوں نے ۱۲۵۸ء میں جب عباسی سلطنت کو ختم کیا تو انھوں نے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان مردوں اور عورتوں کو پکڑ کر اپنے گھروں میں خادم کے طور پر رکھ لیا۔ یہ عورتیں جو تاتاریوں کے گھروں میں پہنچیں، وہ تاتاریوں کے اوپر اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گئیں۔ کبھی براہ راست طور پر اور کبھی بالواسطہ طور پر، اُن کے ذریعہ تاتاریوں تک اسلام کا پیغام پہنچتا رہا۔

براہِ راست تبلیغ کی صورت تو یہ تھی کہ تاتاری اپنے تجسس کے جذبہ کے تحت ان عورتوں (یا مردوں) سے سوال کرتے اور پوچھتے کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ بالواسطہ تبلیغ کی صورت یہ تھی کہ ان مسلم عورتوں اور مسلم مردوں کے طریقوں کو دیکھ کر تاتاری اس کی تفصیل پوچھتے۔ مثلاً وہ ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہوئے سنتے تو پوچھتے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یا کام شروع کرتے ہوئے اُن میں سے کوئی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا اور اس کو سُن کر تاتاری لوگ پوچھتے کہ یہ کیا چیز ہے۔ اسی طرح کبھی وہ ان کی زبان سے قرآن کی کوئی آیت یا کوئی حدیثِ رسول سنتے اور پھر اس کا مفہوم جاننے کی کوشش کرتے، وغیرہ۔

اس طرح یہ مسلم خواتین (مردوں کے ساتھ) اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنی رہیں۔ اُن کی وجہ سے ہر گھر میں اسلام کا پُر امن چرچا ہونے لگا۔ یہ طریقہ پوری ایک نسل تک جاری رہا۔ آخر کار اس کے سبب سے (نیز دوسرے اسباب سے) یہ واقعہ ہوا کہ فاتح تاتاریوں کی اکثر تعداد نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ مقام جہاں بظاہر اسلام کی تاریخ ختم ہوگئی تھی، وہیں سے اسلام کی تاریخ دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ

شروع ہوگئی۔ اس تاریخ ساز واقعہ میں مسلم عورتوں کا حصہ بھی تقریباً اتنا ہی ہے جتنا کہ مسلم مردوں کا حصہ۔

اکبر کی والدہ کی مثال

ملاّ عبدالنبی (وفات ۹۹۱ھ) شہنشاہ اکبر کے زمانہ کے بڑے علماء میں سے ایک تھے۔ ان کی بنوائی ہوئی ایک مسجد اب بھی نئی دہلی میں بہادر شاہ ظفر مارگ کے کنارے موجود ہے جو مسجد عبدالنبی کے نام سے مشہور ہے۔ ملا عبدالنبی شہنشاہ اکبر کے استاد تھے۔ اس بنا پر وہ اکبر کے دربار میں بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے۔

اکبر نے ملاّ عبدالنبی کو حکومت میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ اکبر سے خصوصی تعلق کی بنا پر ملا عبدالنبی کو اس زمانہ میں نہایت عزت کا مقام حاصل ہوا۔ ملاّ عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ منصبِ صدارت کو کسی سلطنت میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جو مُلاّ عبدالنبی کے زمانہ میں اُسے حاصل تھی:

درزمان ہیچ بادشاہی ایں چنیں صدرے باستقلال نگشتہ ...

اکبر کو مُلاّ عبدالنبی سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اُن کے جوتے سیدھا کرتا تھا۔ ان کے مکان پر جا کر اُن سے حدیث سنتا تھا۔ ملا عبدالنبی کی صحبت سے اس کی مذہبیت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ مسجد میں خود اذان دیتا تھا اور ثواب کی خاطر بعض اوقات مسجد میں جھاڑو بھی دیتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اس کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ اکبر نے اپنی مشہور پالیسی کے مطابق، اس دن جو کپڑا پہنا تھا وہ زعفرانی رنگ (گیروے رنگ) کا کپڑا تھا۔ ملا عبدالنبی نے اس کو دیکھا تو وہ اُس کو ہندوانہ رنگ سمجھ کر غصہ ہو گئے اور بھرے دربار میں اکبر کو اپنے عصا سے مار دیا۔ اکبر کو اس پر ناگواری ہوئی مگر وہ خاموشی سے اُٹھ کر محل کے اندر چلا گیا۔ محل کے اندر اُس کی ماں مریم مکانی موجود تھیں۔ اُس نے اپنی ماں سے کہا کہ ملا عبدالنبی نے آج بھرے دربار میں مجھ کو مارا۔ اگر وہ تنہائی میں مجھ کو نصیحت کرتے تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔

اکبر کی ماں مریم مکانی ایک ذہین اور صاحبِ علم خاتون تھیں۔ اُنھوں نے اکبر کی بات سُن کر کہا۔ بیٹے، دل پر میل نہ لانا، یہ تمھارے لئے نجاتِ آخرت کا ذریعہ ہے۔ قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک بے اختیار مُلّا نے بادشاہ کے ساتھ یہ حرکت کی اور سعادت مند بادشاہ نے اس پر صبر کرلیا۔

مآثر الامراء، جلد دوم، صفحہ ۵٦۰۔

مریم مکانی نے اکبر کو جو جواب دیا وہ کوئی سادہ جواب نہ تھا۔ اس میں بیک وقت دو اہم باتیں چھپی ہوئی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مریم مکانی کوئی معمولی خاتون نہ تھیں۔ وہ ایک باکمال مسلم خاتون تھیں۔ مزید یہ کہ مریم مکانی کی زندگی میں اس طرح کے واقعات یقینی طور پر اور بھی بہت سے ہوں گے جن کا ہمیں علم نہیں۔ عین ممکن ہے کہ اکبر کے اندر جو غیر معمولی صفات تھیں وہ بھی کسی نہ کسی طور پر مریم مکانی کی تربیت کے ذریعہ اکبر کو ملی ہوں۔

مریم مکانی کے مذکورہ جواب کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکبر نے ہندو۔ مسلم تعلقات کو بڑھانے کے لیے یہ کیا کہ بعض اجتماعی مواقع پر وہ زعفرانی (یا گیروی) کپڑے پہن لیتا تھا۔ ظاہر پسند علماء اس پر بہت برہم تھے۔ مذکورہ واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مریم مکانی اپنی ذہانت کی بنا پر یہ سمجھتی تھیں کہ اکبر کا یہ طریقہ ہندوانہ رسم کی تقلید نہیں ہے بلکہ وہ ایک گہری دعوتی تدبیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بنا پر مریم مکانی کو اس واقعہ پر وہ غصہ نہیں آیا جو ملا عبدالنبی کو آیا تھا۔ یہ واقعہ مریم مکانی کی شعوری بیداری کا ثبوت ہے۔

موجودہ زمانہ کے علماء میں مولانا حسین احمد مدنی میرے علم کے مطابق، واحد شخص ہیں جنھوں نے اکبر کی روش کو گہرائی کے ساتھ سمجھا اور اس کا اعتراف کیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اکبر نے گیروی کپڑے پہننے اور اس طرح کے دوسرے بعض مراسم کو اختیار کرنے کا جو طریقہ شروع کیا اس کا مقصد ہندو کلچر کو اپنانا نہیں تھا بلکہ وہ ''تالیفِ قلب'' کی نوعیت کا ایک معاملہ تھا۔ اکبر یہ چاہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل ملاپ بڑھے۔ کیوں کہ مولانا حسین احمد مدنی کے الفاظ میں، ''اختلاط باعثِ عدم تنافر ہے، اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا ہے اور تنافر باعثِ ضد اور

ہٹ اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے، اور وہ اسلامی ترقی میں سدراہ ہونے والا ہے۔‘‘

مولانا حسین احمد مدنی نے اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اکبر نے جو پالیسی اختیار کی وہ دراصل برہمنوں کی اس کوشش کو ناکام کرنے کے لیے تھی جس کے تحت وہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے دور کرنا چاہتے تھے۔ اور اس طرح اسلام کے توسیع کے عمل کو روکنا چاہتے تھے۔ مگر اکبری زمانہ کے علماء اس راز کو سمجھ نہ سکے اور اکبر کے مخالف بن کر کھڑے ہوگئے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اکبر کے مخالفین کے بارہ میں لکھا ہے کہ ’’اگرچہ بہت سے اکبر سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے‘‘

مکتوبات شیخ الاسلام، مکتبہ دینیہ دیوبند، جلد ا، صفحہ ۱۴۶

مریم مکانی اگرچہ محل کے اندر رہتی تھیں مگر اُنھوں نے ماں کی حیثیت سے شہنشاہِ اکبر پر گہرا اثر ڈالا۔ اُنھوں نے اکبر کو ایک سادگی پسند اور دین دار بادشاہ بنا دیا۔ نیز مریم مکانی اتنی مدبر تھیں کہ وہ اکبر کی پالیسی کو اُس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھ سکیں۔ جب کہ اُس زمانہ سے لے کر اب تک کے مسلم اہل علم اس منصوبہ کی گہرائی کو سمجھ نہ سکے۔ میرے علم کے مطابق، اس عموم میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ مولانا حسین احمد مدنی کا ہے۔

زندگی کی تعمیر میں عورت کا کردار بے حد اہم ہے۔ اس کردار کو کامیابی کے ساتھ نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ عورت اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔ زندگی کے بیشتر مسائل اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ ضروری تیاری کے بغیر زندگی کے میدان میں داخل ہوجاتے ہیں۔ لوگ یہ جانتے ہیں کہ تعلیمی سرٹیفکٹ کے بغیر انہیں جاب مارکیٹ میں کوئی اچھی جگہ نہیں ملے گی اس لیے ہر ایک پہلے تعلیمی لیاقت پیدا کرتا ہے اور اس کے بعد وہ جاب مارکیٹ میں داخل ہوتا ہے۔ مگر زندگی گزارنے کے فن (art of living) کو سیکھے بغیر ہر ایک، ہر عورت اور مرد زندگی کے میدان میں داخل ہورہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر لوگ اس کامیابی کو حاصل نہیں کر پاتے جو فطرت نے ان کے لیے مقدر کر دیا ہے۔

اکثر عورتوں اور مردوں میں یہ کمی ہوتی ہے کہ ان کو فطری طور پر وہ شخصیت ملی ہوئی نہیں ہوتی

جس کونفسیات کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (balanced personality) کہا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کے اندر سختی زیادہ ہے اور نرمی کم۔ کسی کے اندر غصہ زیادہ ہے اور برداشت کم، وغیرہ۔ اس کمی کو دور کرنے کا کام ہر عورت اور مرد کو خود کرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنی کمی کو جانے اور اپنے شعور کو بیدار کرکے اس کو متوازن بنائے۔

جس طرح بڑھئی ایک لکڑی کو گڑھ کر اس کو اپنے مقصد کے مطابق بناتا ہے، اسی طرح ہر عورت اور مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصیت پر وہی عمل کرے جو بڑھئی ایک لکڑی کے اوپر کرتا ہے۔ وہ مسلسل احتساب کے ذریعہ اپنی کمیوں کو دریافت کرے اور غیر متوازن شخصیت کو متوازن شخصیت کی صورت میں ڈھالے۔ یہ کام ہر ایک کو کرنا ہے۔ اسی عمل پر ہر ایک کی کامیابی کا انحصار ہے، عورت کی کامیابی کا بھی اور مرد کی کامیابی کا بھی۔

عورت ایک انٹیلکچول پارٹنر

ایک عورت اور ایک مرد جب نکاح کرکے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں تو یہ تعلق صرف شوہر اور بیوی کا تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہ تعلق اُتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ خود زندگی وسیع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق نے عورت اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ پورے معنٰی میں ایک دوسرے کے شریک حیات اور شریکِ معاملہ بنیں۔ وہ ایک دوسرے کے کامل مددگار بن جائیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: **من ذکر و انثٰی بعضکم من بعض** (آل عمران ۱۹۵) یعنی خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں ایک دوسرے کا جزء ہیں۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **والمؤمنون والمؤمنٰت بعضهم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر** (التوبہ ۷۱) یعنی ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور وہ بری بات سے منع کرتے ہیں۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ عورت اور مرد کے اندر خالق نے جو سب سے بڑی صفت رکھی ہے وہ نطق (speech) ہے۔ انسان کی انسانیت کا سب سے بڑا اظہار نطق کی سطح پر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت اور مرد جب زندگی میں ایک دوسرے کے مددگار اور شریک معاملہ ہیں تو اس تعلق کا اظہار یقینی طور پر سب سے زیادہ نطق کی سطح پر ہونا چاہیے۔ اگر ایک عورت اور ایک مرد نکاح کرکے ایک دوسرے کے شریکِ زندگی بنیں لیکن نطق کی سطح پر ان کے درمیان کوئی گہرا تعلق قائم نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ صرف نچلی سطح پر شریک حیات بنے ہیں، وہ اعلیٰ سطح پر ایک دوسرے کے شریکِ زندگی نہ بن سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ شادی شدہ زندگی کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں نطق کی سطح پر ایک دوسرے کے شریک بن جائیں۔ ان کے درمیان باہم گفتگو ہو۔ وہ مسائل میں ایک دوسرے سے

تبادلۂ خیال کریں۔ وہ ایک دوسرے کی صرف تعریف نہ کریں بلکہ وہ ایک دوسرے کے خیالات پر ناقدانہ اظہار رائے کریں تا کہ دونوں کی فکری سطح بُلند ہو، معاملات کے نئے گوشے سامنے آئیں۔ دونوں مل کر فکری ارتقاء کے سفر کے مسافر بن جائیں۔

قرآن کی مذکورہ آیتوں میں عورت اور مرد کے باہمی تعلق کا جو ذکر کیا گیا ہے اُس کا کم از کم ایک پہلو یہ بھی ہے۔ یہ بلا شبہہ دونوں کے باہمی تعلق کا ایک فطری تقاضا ہے۔ بے زبان عورت اور بے زبان مرد کے درمیان اگر رشتۂ نکاح قائم ہو تو ممکن نہیں کہ نطق کی سطح پر وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ سکیں۔ لیکن ناطق عورت اور ناطق مرد کا تعلق بلا شبہہ زندہ نطق کا تعلق ہے اور نطق کا یہ تعلق یقینی طور پر محدود نہیں ہوسکتا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے انٹیلکچول پارٹنر (intellectual partner) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اوپر جو بات بیان کی گئی، اس کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ شادی سے پہلے یا شادی کے بعد عورت اور مرد دونوں اس پہلو سے اپنے آپ کو تیار کریں۔ مطالعہ اور اکتسابِ علم کے ذرائع کو استعمال کر کے دونوں اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ وہ حقیقی طور پر ایک دوسرے کے لیے انٹیلکچول پارٹنر (فکری رفیق) بن سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انٹیلکچول پارٹنر شپ ایک آرٹ ہے، اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خواتین کے لیے ڈومسٹک سائنس یا پروفیشنل ایجوکیشن سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ وہ انٹیلکچول پارٹنر شپ کے آرٹ کو سیکھیں اور اس کی ماہر بنیں — اسلام نے زندگی کا جو تصور دیا ہے اُس کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو بلا شبہہ یہ بھی ہے۔ اور زندگی کو پوری طرح خوش گوار بنانے کے لیے یہ بے حد اہم ہے۔

سنت کی روشنی میں

صحیح البخاری (کتاب التہجد، باب الحدیث بعد رکعتی الفجر) اور صحیح مسلم (کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب صلاۃ اللیل والوتر) میں عن ابی سلمہ عن عائشہ کے حوالہ سے ایک روایت آئی ہے۔ عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اُٹھتے پھر آپ فجر کی دو رکعت سنت ادا کرتے۔ اگر میں بیدار ہوتی تو آپ اس کے بعد مجھ سے گفتگو کرتے ورنہ لیٹ جاتے۔ یہاں تک کہ

تکبیر کی آواز آتی تو آپ نماز فجر کے لیے مسجد میں چلے جاتے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا صلّی سنۃ الفجر فان کنت مستیقظۃ حدثنی والا اضطجع حتی یؤذّن بالصلاۃ (البخاری)

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلّی رکعتی الفجر فان کنت مستیقظۃ حدثنی والا اضطجع (مسلم)

ابن حجر العسقلانی نے اپنی کتاب فتح الباری بشرح صحیح البخاری میں مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے بعض اور حوالوں کے ساتھ اس روایت کو کچھ دوسرے الفاظ میں بھی نقل کیا ہے۔ ان میں سے دو روایت کے الفاظ یہ ہیں:

کان یصلی من اللیل، فاذا فرغ من صلاتہ اضطجع، فان کنت یقظیٰ تحدث معی، وان کنت نائمۃً نام حتی یاتیہ المؤذن۔

فان کنت یقظیٰ تحدث معی، و ان کنت نائمۃ اضطجع (فتح الباری ۳/ ۵۴)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اہلیہ عائشہ صدیقہ سے رات کے آخری حصہ میں نماز فجر سے پہلے گفتگو فرماتے تھے۔ تاہم یہ گفتگو استثنائی طور پر صرف رات کو نہیں ہوسکتی۔ اس سے دراصل پیغمبر اسلام کا ایک عام طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کا معمول تھا کہ آپ عائشہ صدیقہ کے ساتھ دینی مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس روایت میں حدثنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جس کو عام طور پر انٹیلکچول ایکسچینج کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث سے اور (اس طرح کی دوسری روایتوں سے) پیغمبر اسلام کی ایک اہم سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ عورت کو اپنا شریکِ ذہنی (intellectual partner) بنایا جائے۔ دین وملت کے مسائل پر گفتگو کر کے عورت کی ذہنی تربیت کی جائے۔ یہاں تک کہ مرد کے ذہنی سفر میں وہ اُس کی برابر کی شریک بن سکے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ صدیقہ سے جو گفتگو کرتے تھے اُس کی پوری تفصیل تو آج موجود نہیں۔ مگر بالواسطہ طور پر اُس کے نتیجہ کا ریکارڈ حدیث کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، عائشہ صدیقہ سے ۲۲۱۰ روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ مگر دوسرے راویوں کی طرح، یہ صرف اقوال رسول پر مبنی نہیں ہیں۔ ان روایتوں کا بڑا حصہ وہ ہے جن کو استنباطاتِ عائشہ کہا جاتا ہے، یعنی عائشہ صدیقہ کے اپنے مستنبط اقوال۔

یہ استنباطات کیا ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہاں اس کی ایک مثال درج کی جاتی ہے۔ صحیح البخاری (کتاب الأدب) میں ایک روایت آئی ہے۔ اس روایت میں عائشہ صدیقہ کہتی ہیں: **ما خُيِّر رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين إلا اختار ايسرهما** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان امر کا انتخاب فرماتے)۔

عائشہ صدیقہ کی یہ روایت بتاتی ہے کہ طریقِ کار کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی جنرل پالیسی کیا تھی۔ وہ تھی— آسان انتخاب (easier option) کو لینا اور مشکل انتخاب (harder option) کو چھوڑ دینا۔ مثلاً نزاعی معاملہ میں متشددانہ طریقِ کار (violent method) کے مقابلہ میں پر امن طریقِ کار (peaceful method) کا انتخاب کرنا، وغیرہ۔ عائشہ صدیقہ کی یہ روایت اتنی اہم ہے کہ اس کو مدبّرانہ سیاست کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلح اسلامی تحریکیں سب کی سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اس کا واحد سبب بلاشبہہ یہی ہے کہ ان تحریکوں میں عائشہ صدیقہ کی مذکورہ روایت سے استفادہ کرتے ہوئے پر امن طریقِ کار کو اختیار نہ کیا جاسکا۔ حالانکہ وہ پوری طرح قابل حصول تھا۔ عائشہ صدیقہ کے مذکورہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ نہیں ہیں۔

یہ عائشہ صدیقہ کا ذاتی قول یا استنباط ہے۔ پھر عائشہ صدیقہ کو یہ اہم بات کیسے معلوم ہوئی۔ یقینی طور پر ایسا ہوا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عائشہ صدیقہ کے درمیان بار بار وہی چیز پیش آئی ہوگی جس کو ہم نے تبادلۂ خیال (intellectual exchange) کہا ہے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے عمل کو دیکھ کر ایسا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ دوسرے صحابہ نے بھی آپ کے عمل کو بار بار دیکھا۔ مگر کسی اور صحابی نے رسول اللہ ﷺ کی پالیسی کے بارے میں مذکورہ بات نہیں کہی۔ یہ گہرا فکر عائشہ صدیقہ کے ذہن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار گفتگو کے بعد ہی واضح ہوا ہوگا۔ یہ بات اتنی کھلی ہوئی ہے کہ خود قرینہ ہی اس کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

عائشہ صدیقہ کے جو استنباطات ہیں ان کی بنیاد کیا ہے۔ وہ کیسے اس قابل ہوئیں کہ وہ اتنے صحیح قسم کے شرعی استنباطات کر سکیں۔ اس کا راز پیغمبر اسلام سے ان کی وہ گفتگوئیں ہیں جو شب و روز اور سفر وحضر میں جاری رہتی تھیں۔ عائشہ صدیقہ نہایت ذہین خاتون تھیں۔ انہوں نے اخّاذ طبیعت پائی تھی۔ پیغمبر اسلام کی گفتگوؤں سے وہ روح شریعت اور حقیقت اسلام کا علم حاصل کرتی رہتی تھیں۔ یہی وہ علم ہے جو استنباطات عائشہ کی صورت میں حدیثوں میں منقول ہوا ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مذکورہ قسم کا استنباط سادہ طور پر نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بار بار گفتگو ہو، سوال و جواب ہو، دو طرفہ تبادلۂ خیال ہو۔ اس طرح کے لمبے ذہنی عمل (intellectual process) کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات آدمی کے ذہن میں واضح ہو۔ وہ ایک متعین فکر کی صورت میں آدمی کے ذہن میں بیٹھ جائے جس کو وہ بعد میں وضوح (clarity) کے ساتھ بیان کرسکے۔

عائشہ صدیقہ نے بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو اُسی صورت میں یا اُنہی الفاظ کے ساتھ قرآن یا حدیث میں موجود نہیں۔ وہ تمام تر اُن کے اپنے الفاظ میں ہیں۔ اس قسم کے اقوال کو استنباطات کہا جاتا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ عائشہ صدیقہ کے یہ اقوال پیغمبر خدا کی مسلسل صحبت سے اکتسابِ فیض کے نتیجہ میں حاصل شدہ دینی بصیرت ہے۔ وہ دراصل استفادات ہیں نہ کہ محض استنباطات۔ اس قسم کی گہری دینی بصیرت کی مثال عائشہ صدیقہ کے سوا کسی دوسرے مرد یا عورت کے یہاں نہیں ملتی۔

عائشہ صدیقہ نے اپنے مذکورہ قول میں پیغمبر اسلام کی جنرل پالیسی کو بتایا ہے۔ اور وہ ہے — نزاعی معاملات میں مشکل انتخاب (harder option) کو چھوڑنا اور آسان انتخاب

(easier option) کو لے لینا۔ یہ چھوٹا سا قول حکمت وبصیرت کا خزانہ ہے۔ یہ عملی سیاست کا وہی اُصول ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مدبّرین نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

Politics is the art of the possible.

یہ اصول انتہائی گہری بصیرت پر مبنی ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں اس کی ایک مثال صلح حدیبیہ کی صورت میں ملتی ہے۔ یہ اُصول اتنی زیادہ گہری دانش مندی پر مبنی ہے کہ عائشہ صدیقہ کے اس اعلان کے باوجود بعد کی صدیوں میں کوئی مسلم رہنما ایسا نظر نہیں آتا جو اس کو جانے اور اس کو استعمال کرے۔ بدقسمتی سے اس بے خبری کا سلسلہ اکیسویں صدی تک جاری ہے۔ موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ مسلم رہنماؤں کی بے فائدہ مسلّح جنگ اسی بے خبری کا ایک ثبوت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں پُر امن جدوجہد (peaceful struggle) کے مواقع پوری طرح کھل چکے ہیں جس کی حیثیت بلاشبہہ آسان انتخاب کی ہے۔ اس کے باوجود مسلم رہنما غیر ضروری طور پر پُر تشدد جنگ میں مشغول ہیں جو کہ واضح طور پر مشکل انتخاب کی حیثیت رکھتی ہے— اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحبت کے بغیر صرف قرآن وحدیث کو پڑھ کر بصیرت کا حصول کتنا زیادہ مشکل کام ہے، بلکہ شاید ممکن ہی نہیں۔

صحیح البخاری میں عائشہ صدیقہ کی ایک روایت آئی ہے۔ اس میں وہ کہتی ہیں کہ قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل ہوئی وہ مفصل سورتیں تھیں جن میں کہ جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف رجوع ہو گئے تو حرام اور حلال کے احکام اترے اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو ضرور وہ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر یہ اترتا کہ تم لوگ زنا نہ کرو تو ضرور وہ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تألیف القرآن (رقم الحدیث ۴۹۹۳)

جیسا کہ معلوم ہے، عائشہ صدیقہ کی سال پیدائش ۶۱۳ء ہے، یعنی ہجرت سے نو سال قبل۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول ۶۱۰ء میں شروع ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جب

مکہ میں اترنا شروع ہوا، اس وقت عائشہ صدیقہ پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت وہ صرف نو سال کی تھیں، یعنی اپنی بچپن کی عمر میں۔

ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ عائشہ صدیقہ کو مکی دور کی آیتوں کے نزول کی حکمت کیسے معلوم ہوئی۔ جب کہ اُس وقت وہ یا تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں یا وہ ابھی بہت چھوٹی تھیں۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ہجرت کے بعد جب وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلسل رہنے لگیں تو تبادلۂ خیال کے دوران یہ مسائل زیر بحث آئے اور سوال وجواب کے ذریعہ ان کی وضاحت ہوئی۔ گویا کہ مذکورہ واقعہ کا علم عائشہ صدیقہ کو ذاتی مشاہدہ کے ذریعہ نہیں ہوا بلکہ مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ ہوا۔

عائشہ صدیقہ نے پیغمبر اسلام کی تربیت میں رہ کر جو بات دریافت کی اور مذکورہ روایت میں اس کو بتایا، وہ بے حد اہم ہے۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ اسلام کا طریقہ معاشرہ کی اصلاح کے لیے کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، سوشل انجینئرنگ (social engineering) کا وہ طریقہ کیا ہے جس کے ذریعہ کسی معاشرہ میں مثبت اور حقیقی نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں اور انسانی معاشرہ میں حقیقی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ وہ طریقہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ پہلے فکری مہم کے ذریعہ افراد کے ذہن کو بدلنا اور پھر سماج کی سطح پر احکامِ شریعت کا نفاذ کرنا۔

عجیب بات ہے کہ یہ حقیقت عائشہ صدیقہ نے پیغمبر اسلام کی دس سالہ صحبت میں جان لی تھی اور امت کو اس سے باخبر کردیا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اور مفکرین سارے قرآن وحدیث کو پڑھنے کے باوجود اس اہم حقیقت سے بے خبر رہے اور اب تک بے خبر ہیں۔ وہ ایک کے بعد ایک مسلم ملکوں میں اقتدار پر قبضہ کرکے اچانک اسلامی شریعت کے نفاذ کی کوشش کررہے ہیں۔ مگر ہر بار یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ، عائشہ صدیقہ کے الفاظ میں، لوگ یہ کہہ کر قبولیتِ احکام سے انکار کردیتے ہیں کہ — **لاندع الخمر ابداً و لا ندع الزنا ابداً**۔ اس ناکامی کا سبب یقینی طور پر یہی ہے کہ ذہن سازی کا کام کیے بغیر احکام کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے عائشہ صدیقہ کو پیغمبر اسلام کی زوجیت میں دے کر ان کو اس حقیقت کی معرفت کا موقع دیا اور اُن کی زبان سے اس کا اعلان کرایا۔ مگر عجیب بات ہے کہ لوگ جذباتی سیاست میں اس طرح گُم ہیں کہ اتنے بڑے اہتمام کے باوجود آج بھی وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔

عائشہ بنت ابی بکر الصدیق مکہ میں ہجرت سے نو سال پہلے پیدا ہوئیں اور ۶۷ سال کی عمر میں ۵۸ھ میں مدینہ میں اُن کی وفات ہوئی۔ وہ پیغمبر اسلام کی عمر کے آخری دس سالوں میں آپ کی اہلیہ کی حیثیت سے برابر آپ کے ساتھ رہیں۔ اس طرح اُن کو یہ موقع ملا کہ وہ علم نبوت سے زیادہ سے زیادہ اکتساب کر سکیں۔

پیغمبر اسلام کے ساتھ اس قریبی تعلق کی بنا پر ایسا ہوا کہ وہ فکری حیثیت سے اسلام کا ایک ماخذ بن گئیں۔ اُن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ علم کے اعتبار سے خواتین اسلام میں سب سے زیادہ ممتاز تھیں (**افقه نساء المسلمين واعلمهن بالدين والأدب**)۔ اُن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اکابر صحابہ اُن سے فرائض کے بارہ میں پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک کو اس کا جواب دیتی تھیں (**وكان اكابر الصحابة يسألونها عن الفرائض فتجيبهم**)۔ وہ روایت وحدیث کے بارے میں مرجع کی حیثیت رکھتی تھیں (**وكانت مرجعاً في الرواية والحديث**)۔

خیر الدین الزرکلی، الاعلام، جلد ۳، صفحہ ۲۴۰

عائشہ صدیقہ کے اندر یہ اعلیٰ صفت اپنے آپ پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ یقینی طور پر پیغمبر کے ساتھ مسلسل فکری استفادہ کا نتیجہ تھی۔

اسلام کا ایک اہم مطلوب وہ ہے جس کو اضافۂ ایمان یا ازدیادِ ایمان کہا گیا ہے۔ اس سے مراد ذہنی ارتقاء (intellectual development) ہے۔ یعنی دین اور تقویٰ کے اعتبار سے انسان کے اندر مسلسل اضافہ ہونا۔ آدمی کی ایمانی شخصیت میں مسلسل ارتقاء کا عمل جاری رہنا۔

ایمانی ارتقاء یا ذہنی اضافہ کا یہ عمل مختلف ذرائع سے ہوتا ہے — قرآن میں تدبّر کرنا، اللہ کو یاد کرنا اور اُس کے بارہ میں غور وفکر کرنا، مخلوقاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرنا اور اُس کے حکیمانہ پہلوؤں کے بارہ

میں سوچنا۔ اس عمل کے دوران انسان کو ضرورت ہوتی ہے کہ اُس نے دین کے بارہ میں جو کچھ پایا ہے اُس پر وہ کسی سے تبادلۂ خیال (intellectual exchange) کرے۔ اس تبادلۂ خیال کے دوران افکار کی وضاحت ہوتی ہے۔ معاملہ کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اپنے یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تبادلۂ خیال ذہنی ارتقاء کے لیے بے حد ضروری ہے۔

یہ تبادلۂ خیال ہر شخص کے ساتھ جاری رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر کے بارہ میں آیا ہے کہ وہ ہر ایک سے بات کر کے اُس سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے (**کان یتعلم من کل احد**)۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اس مقصد کے لیے کسی کو مستقل طور پر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اس اعتبار سے کسی آدمی کا مسلسل رفیق صرف ایک ہو سکتا ہے، اور وہ اُس کی بیوی ہے۔ ہر آدمی کی یہ ایک علمی اور دینی ضرورت ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تعلیم و تربیت دے کر اس قابل بنائے کہ وہ حقیقی معنوں میں اس کی انٹیلکچول پارٹنر (ذہنی رفیق) بن سکے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہ اہل اسلام کے لیے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہیں۔ چنانچہ آپ نے شریک حیات کی نسبت سے بھی لوگوں کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ قائم کیا ہے۔ آپ کے اس نمونہ کا تعلق محدود طور پر صرف عائشہ صدیقہ سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک عام اصول ہے۔ اس کا تعلق دوسری خواتین سے بھی ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں آپ کی اہلیہ ام سلمہ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو اس معاملہ کی وضاحت کے لیے ایک اچھی مثال ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی دور میں جب قریش مکہ سے وہ معاہدہ کیا جو معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے تو صحابہ میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ کیوں کہ یہ معاہدہ بظاہر دب کر کیا گیا تھا اور اس میں کئی باتیں صریح طور پر مخالفین کے حق میں تھیں۔ چنانچہ لوگوں میں بہت زیادہ غم و غصہ تھا۔ معاہدہ کی تکمیل کے بعد آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اب ہمیں مکہ نہیں جانا ہے بلکہ حدیبیہ سے واپس ہو کر مدینہ جانا ہے۔ اس لیے قربانی کے جانور جو تم اپنے ساتھ لائے ہو، ان کو یہیں ذبح کر دو اور سر منڈا لو۔ مگر کوئی بھی شخص اس کے لیے نہ اُٹھا۔ آپ نے تین بار اپنے حکم کو دہرایا پھر بھی تمام لوگ خاموش رہے اور کوئی اپنی جگہ سے نہ اُٹھا۔

پیغمبر اسلام رنج کی حالت میں وہاں سے لوٹ کر اپنے خیمہ میں گئے جہاں آپ کی اہلیہ ام سلمہؓ موجود تھیں۔ انہوں نے آپ کو غمگین دیکھ کر اس کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ آج وہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو حکم دیا مگر ان میں سے کوئی بھی میرے حکم کی تعمیل کے لیے نہیں اُٹھا۔ ام سلمہ نے کہا: اے خدا کے رسول، اگر آپ کی رائے یہی ہے تو آپ میدان میں جائیں اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی قربانی کا جانور ذبح کر دیں اور اپنا سر حلق کروالیں۔ اس طرح لوگ جان لیں گے کہ بات ختم ہوگئی، اب کچھ اور ممکن نہیں۔

آپ خیمہ سے باہر نکلے اور کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی قربانی ذبح کی اور نائی کو بلا کر سر منڈ ایا۔ اس کے بعد ہر ایک نے اُٹھ کر اپنی اپنی قربانی کے جانور ذبح کیے اور اپنا سر منڈ الیا۔ اگر چہ ان کے رنج وغم کا حال یہ تھا کہ راوی کہتے ہیں کہ جب وہ ایک دوسرے کے سر مونڈ نے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کا سر کاٹ ڈالیں گے۔

صحیح البخاری، کتاب الشروط، (رقم الحدیث ۲۷۳۱، ۲۷۳۲)

مذکورہ واقعہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ وہ دراصل اسی چیز کی ایک کامیاب مثال ہے جس کو ہم نے مرد اور عورت کے درمیان انٹیلکچو ل ایکسچینج (intellectual exchange) کا نام دیا ہے۔ یقیناً رسول اور زوجۂ رسول کے درمیان اس موقع پر ایک مکمل گفتگو ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد وہ صورت پیش آئی جس کا حدیث وسیرت کی کتابوں میں ذکر ہوا ہے۔ اس قسم کا حل ہمیشہ اس وقت سامنے آتا ہے جب کہ دو آدمی باہم گفتگو اور تبادلۂ خیال کریں۔ اس طرح کا حل کبھی خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ دوطرفہ گفتگو کا نتیجہ ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام کی اہلیہ ام سلمہ نے جو بات کہی وہ بے حد اہم تھی۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ پیغمبر خود جب اپنا اونٹ ذبح کر دیں گے اور اپنا سر حلق کروالیں گے تو اس کے دیکھنے کے بعد وہاں کے موجود مسلمان یہ سمجھ لیں گے کہ اب معاملہ ختم ہوگیا۔ اب ہم لوگوں کو عمرہ کے لیے مکہ کا سفر نہیں کرنا ہے بلکہ حدیبیہ ہی سے واپس ہو کر مدینہ جانا ہے۔ جب یہ بات عملاً لوگوں پر کھُل جائے گی تو اس کے بعد لوگوں

کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ وہ حدیبیہ میں اپنی قربانی کا جانور ذبح کریں اورحلق کروالیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب پیغمبر اسلام نے اپنا قربانی کا جانور ذبح کردیا تو دوسروں نے بھی اپنے جانور ذبح کرکے حلق کروالیا۔

ام سلمہ کے اندر یہ حکیمانہ فکر کیسے پیدا ہوئی۔ یقیناً وہ پیغمبر کے ساتھ گفتگو اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ اس اعتبار سے گویا ام سلمہ صرف زوجۂ رسول نہ تھیں بلکہ وہ مدرسۂ نبوت کی ایک طالبہ تھیں۔ اپنی اسی حیثیت کی بنا پر اُنہیں یہ حکمت حاصل ہوئی جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اسلام میں زندگی کا جو فطری نقشہ بتایا گیا ہے اُس کا ایک جزء بلاشبہہ یہ بھی ہے۔ اسلام کے مطابق، ہر عورت اور مرد کو جو بامقصد زندگی گزارنی ہے، اس میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے صرف شریکِ خانہ نہیں ہیں بلکہ وہ پورے معنوں میں ایک دوسرے کے لیے شریکِ زندگی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے عملی رفیق بھی ہیں اور اسی کے ساتھ ایک دوسرے کے فکری رفیق بھی۔

عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے فکری مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے درمیان جس طرح ڈسکشن ہوسکتا ہے ویسا ڈسکشن کسی اور کے ساتھ ہونا سخت مشکل ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے کتنا زیادہ اہم ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی لازمی ضرورت ہیں۔

ایک عورت اور ایک مرد جب ازدواجی رشتہ کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرتے ہیں تو گویا کہ دونوں اپنے لیے فطری انداز میں وہ ساتھی پالیتے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کو سمجھے اور ہر ایک دوسرے کا انٹیلکچول پارٹنر بن جائے۔

اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ شادی شدہ زندگی کو ہر حال میں نبھانا چاہیے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر اس کو طلاق کی حد تک نہیں جانے دینا چاہیے۔ شادی شدہ زندگی شروع کرنے کے بعد گویا عورت اور مرد اپنی ایک تاریخ شروع کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں طلاق اور تفریق کی حیثیت گویا بریک ان

ہسٹری (break in history) جیسی ہے۔ لوگ اگر اس حقیقت کو جانیں تو وہ طلاق کی صورت میں بریک ان ہسٹری کے مہلک انجام سے اس طرح بچیں جس طرح ایک سرکاری ملازم ایک ایسے فعل سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے جو اس کے لیے بریک ان سروس (break in service) کے ہم معنٰی ہو۔

عورت اور مرد کے درمیان اس قیمتی تعلق کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اس معاملہ میں باشعور ہوں۔ نفسیات بتاتی ہے کہ اس باہمی تعلق کو قائم کرنے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ مرد کی طرف سے اس کی بڑھی ہوئی انانیت ہے، اور عورت کی طرف سے اس کی بڑھی ہوئی انفرادیت (individuality)۔ ضروری ہے کہ دونوں اس معاملہ میں اپنی اپنی کمزوری سے واقف ہوں۔ مرد اپنی انا پر کنٹرول کرے اور عورت اپنی انفرادیت کو اس کی حد کے اندر رکھے۔ یہ دونوں کے لیے گویا نفسیاتی مینجمنٹ (management) کا معاملہ ہے۔ یہی وہ تدبیر ہے جس کے ذریعہ دونوں اپنی ذاتی زندگی کو بھی مفید بنا سکتے ہیں اور سماج کے لیے بھی زیادہ بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

عورت معمار انسانیت

قرآن میں حج کے تذکرہ کے تحت ارشاد ہوا ہے: صفا اور مروہ بے شک اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں۔ پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے:

ان الصفا و المروۃ من شعائر اللّٰہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما۔ (البقرہ ۱۵۸)

آیت میں شعیرہ (جمع شعائر) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ شعیرہ کے لفظی معنٰی یادگار یا نشانی (symbol) کے ہیں۔ اس بیان کے مطابق، صفا اور مروہ خدا کی دو نشانیاں ہیں۔ وہ ایک خدائی واقعہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اسی یاد کو تازہ کرنے کے لئے حکم دیا گیا کہ جو عورت یا مرد حج یا عمرہ کے لئے مکہ جائے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے۔

صفا اور مروہ مکہ کے قریب دو چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ دونوں کے درمیان تقریباً ۷ فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ اب سے چار ہزار سال پہلے ایسا ہوا کہ خدا کے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام یہاں آئے۔ ابراہیم عراق میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ مختلف علاقوں کا سفر کرتے ہوئے آخر میں مکہ پہنچے۔ یہاں اس وقت صحراء اور خشک پہاڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوئی انسانی آبادی یہاں موجود نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک خدائی منصوبہ کے تحت اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے چھوٹے بچہ اسماعیل کو یہاں مکہ کے قریب لا کر چھوڑ دیا اور واپس چلے گئے۔

ان کے ساتھ صرف ایک مشک کے بقدر پانی تھا۔ چند دن کے بعد جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو ہاجرہ پانی کی تلاش میں نکلیں۔ اس تلاش کے تحت انھوں نے صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگائے۔ سات چکر کے بعد وہ مایوس ہو کر واپس آئیں تو دیکھا کہ بچہ کے پاس پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ یہ وہی چشمہ تھا جو بعد کو زمزم کے نام سے مشہور ہوا۔

صفا اور مروہ کے درمیان ہاجرہ کا سات بار سعی کرنا ایک بڑے مقصد کے تحت تھا۔ چنانچہ وہ خدا

کو اتنا زیادہ قابل قدر معلوم ہوا کہ اس نے حکم دے دیا کہ جو لوگ بھی دنیا کے کسی حصہ سے حج اور عمرہ کی عالمی عبادت کے لئے یہاں آئیں وہ صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کریں، جیسا کہ ہاجرہ نے کیا تھا۔ چنانچہ آج تک یہ طریقہ حج اور عمرہ کے ساتھ جاری ہے۔ یہ سعی ہر مرد و عورت اور ہر چھوٹے اور بڑے کو کرنی پڑتی ہے۔ اس میں کسی بھی مرد یا عورت کا استثنا نہیں۔

ہاجرہ کے اس فعل کی کیا اہمیت تھی کہ تمام دنیا کے لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ہاجرہ کے نقش قدم (foot step) پر چلیں۔ وہ اہمیت ہاجرہ کے اس غیر معمولی کام کی تھی جس کے لئے ابراہیم نے ان کو اس غیر آباد مقام پر بسایا تھا۔ وہ کام تھا — اپنی زندگی کو قربان کر کے ایک نئی نسل تیار کرنا۔

مکہ کا یہ غیر آباد علاقہ دراصل ایک صحرائی تربیت گاہ کے طور پر منتخب کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تمدن کی آمیزشوں سے پاک اس مقام پر ایک نئی انسانی نسل تیار ہو۔ ایک ایسی نسل جو فطرت کے ماحول میں تربیت پائے۔ جو سادگی اور حقیقت پسندی اور اخلاقی بلندی کی صفات سے متصف ہو۔ جو پوری طرح اپنے پیدائشی مزاج پر پرورش پائے اور پھر اپنے محفوظ انسانی اوصاف کی بنا پر خدا کے دین کی حامل بن سکے — بنو اسماعیل اسی تربیت یافتہ نسل سے تعلق رکھتے تھے جن میں پیغمبر اسلام پیدا ہوئے اور وہ تمام قیمتی انسان پیدا ہوئے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

اس ابراہیمی منصوبہ کے ذریعہ دراصل یہ بتایا گیا کہ عورت کا رول انسانی تاریخ میں کیا ہے۔ وہ رول انسانی نسلوں کی تربیت ہے۔ یعنی ہر ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو تیار کرنا۔ پرانے خون (old blood) میں نئے خون (new blood) کا اضافہ کرنا، تاکہ انسانی نسل ایک بہتی ہوئی دریا کی مانند ہو نہ کہ کسی بند پانی کی مانند۔

جیسا کہ معلوم ہے، انسان بچہ کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ بوڑھا ہو کر سو سال کے اندر مر جاتا ہے۔ یہی ہر عورت اور ہر مرد کا معاملہ ہے۔ اس تخلیقی نقشہ کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ تمام انسان اپنے ابتدائی دور میں بچہ کی صورت میں اپنی ماؤں کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ بچپن کی یہ عمر ہر آدمی کے لئے تیاری کا زمانہ (preparatory period) کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ آدمی کی ذہن سازی

(conditioning) کا دور ہوتا ہے۔ اس ابتدائی دور میں عورت اور مرد جیسے بن جاتے ہیں ویسے ہی وہ آخر تک باقی رہتے ہیں۔

فطرت کے نظام میں ابتدائی عمر کا یہ مرحلہ ماں کی صورت میں عورت کو دیا گیا ہے۔ عورت ماں اور سرپرست کی صورت میں ابتدائی عمر کے تمام انسانی مجموعہ کی امین ہے۔ اس کو یہ فریضہ سونپا گیا ہے کہ وہ ابتدائی عمر میں انسان کے اندر وہ مزاج اور وہ سیرت اور وہ اخلاق پیدا کرے جس کے نتیجہ میں ہر انسان اپنے سماج کا صالح ممبر بن سکے۔

پیغمبر ابراہیم کی زوجہ ہاجرہ نے عورت کے اسی منصوبہ بند کردار کا ایک اعلیٰ تاریخی نمونہ قائم کیا۔ ہاجرہ کی غیر معمولی قربانی نے تاریخ بشری میں پہلی بار وہ قیمتی انسان تیار کئے جو پیغمبر آخرالزماں کے لیے ایک قابل اعتماد ٹیم بن سکے اور تاریخ انسانی میں وہ انقلاب برپا کرے جس کو مسلمہ طور پر سب سے بڑا انقلاب مانا جاتا ہے۔

حج اور عمرہ کی عالمی عبادت میں ہاجرہ کے نقش قدم پر سعی کرنے کا مستقل طریقہ اسی لئے مقرر کیا گیا تاکہ بعد کی نسلوں کو یہ سبق دیا جائے کہ اسی نمونہ کو آئندہ بھی مسلسل دہراتے رہنا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ چنانچہ اسلام کی پوری تاریخ میں اس طریقہ پر عمل جاری رہا۔

اس عمل کی صورت یہ تھی کہ ہر گھر کو، قرآن کے الفاظ میں، قبلہ (یونس، ۸۷) کی حیثیت دے دی جائے۔ اس ہدایت کے تحت یہ ہوا کہ ہر گھر ایک تعلیمی ادارہ (educational institution) اور تربیتی مرکز (training centre) بن گیا۔ اب جو بچہ پیدا ہوتا وہ اپنی ماں کی سرپرستی میں رات دن تعلیم وتربیت حاصل کرتا۔ ہر بچہ اپنے مرحلۂ تیاری (preparatory period) میں شعوری اور غیر شعوری طور پر وہ انسان بنتا رہتا جو ایک صحت مند معاشرہ کو درکار ہوتا ہے۔

نسل انسانی کی اس تربیت کا سلسلہ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز اسلام کے بعد ہزار سال تک سماج میں کبھی وہ بگاڑ نہیں آیا جس کا مشاہدہ آج ہورہا ہے۔ اس لمبی مدت کے دوران گھریلو تربیت کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ اخلاقی اقدار (moral values) سماجی روایات میں

شامل ہوگئیں۔ ہر عورت اور مرد شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ انسانی قدروں کا پابند بنا رہا۔ خاندانی اور سماجی روایات کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ کوئی ان انسانی قدروں سے بغاوت کی ہمت نہ کرتا تھا۔

مگر اب یہ صورت حال بدل چکی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جدید صنعتی انقلاب (industrial revolution) نے زندگی کا نقشہ مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں گھر کا وہ ادارہ ٹوٹ پھوٹ گیا جو انسان کی اخلاقی تشکیل کرتا تھا، جو مسلسل طور پر سماج کو تربیت یافتہ انسان فراہم کرنے کا کام کر رہا تھا۔

اسلام کے ظہور کے بعد ایک ہزار سال تک دنیا میں زرعی دور قائم رہا۔ اس زمانہ کی اقتصادیات مبنی بر زمین اقتصادیات (land-based economy) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس معاشی نظام کے تحت ہر خاندان اپنی زمین سے جڑا رہتا تھا۔ اس بنا پر خاندانی انتشار کی وہ صورت پیش نہیں آتی تھی جو آج عمومی طور پر دکھائی دے رہی ہے۔

صنعتی انقلاب نے معاشیات کی بنیاد کو زمین سے ہٹا کر مختلف شعبوں میں پھیلا دیا۔ اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ روایتی تعلیم کی اہمیت ختم ہوگئی۔ اب جدید صنعتی ضرورتوں کے تحت سائنسی تعلیم اور ٹیکنیکل تعلیم کا رواج بڑھ گیا جس نے قدیم تعلیمی تصور کو بالکل بدل دیا۔ اب معاشی ترقی کے لئے ضروری ہوگیا کہ آدمی اسکول اور کالج کی تعلیم حاصل کرے۔ وہ سرٹیفیکٹ اور ڈگری کے اعتبار سے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ ثابت کرے۔

دور کی اس تبدیلی نے ہر گھر کی قدیم حیثیت ختم کردی۔ پہلے یہ تھا کہ ہر گھر، عورت کے انتظام کے تحت، تعلیم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر گھر نسل انسانی کی تربیت گاہ کا کام کر رہا تھا۔ مگر نئے دور نے اس روایتی تعلیم کی اہمیت گھٹا دی۔ ہر آدمی یہ چاہنے لگا کہ اپنے بچہ کو چھوٹی عمر ہی میں نرسری یا اسکول میں داخل کرے۔ اس تبدیلی نے انسانی معاشرہ کو یکسر بدل دیا۔ اب ایسے نوجوان پیدا ہونے لگے جو اخلاقی قدروں سے آزاد تھے۔ وہ صرف اپنی خواہش کو جانتے تھے نہ کہ کسی اصول یا معیار کو۔ آج ہمارا پورا معاشرہ اسی قسم کا ایک جنگل بنا ہوا ہے۔

تاہم اس صورت حال میں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ حالات کو سمجھ کر اس کے مطابق نئی منصوبہ بندی کی جائے۔ قدیم ٹوٹے ہوئے نظام تربیت کو نئی صورت میں قائم کر دیا جائے۔

ہاجرہ کے زمانہ میں انسانی تربیت کا جو مدرسہ بنایا گیا وہ مبنی بر صحرا (desert-based) مدرسہ تھا۔ پیغمبر اسلام کے ظہور کے بعد اس مقصد کے لئے جو مدرسہ بنا وہ مبنی بر خانہ (home-based) مدرسہ تھا۔ اب ضرورت ہے کہ اس تربیتی نظام کو دوبارہ مبنی بر اسکول (school-based) نہج پر قائم کیا جائے۔ تربیت انسانی کا مطلوب کام پہلے صحرا کے ماحول میں کیا گیا۔ یہ سلسلہ دو ہزار سال سے زیادہ مدت تک جاری رہا۔ اس کے بعد تربیت انسانی کا یہ کام گھر کے ماحول میں کیا گیا جو تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ اب ضرورت ہے کہ اس اہم کام کو اسکول کے ماحول میں دوبارہ جاری کر دیا جائے۔

زمانہ کی یہ تبدیلی بتاتی ہے کہ جدید دور میں جو کچھ ہوا ہے وہ صرف یہ کہ اس نے عورت کے مقام عمل (work place) کو بدل دیا ہے۔ نسل انسانی کی تربیت کے لئے عورت کی یہ فطری ذمہ داری ہے۔ اس لحاظ سے اس کے عمل کا مقام اب خصوصی طور پر اسکول بن گیا ہے۔ جدید تقاضوں نے یہ کیا ہے کہ اب انسان کی پوری نسل گھر سے نکل کر اسکول میں آجاتی ہے۔ اس لئے اب اسکول ہی وہ مقام ہے جس کا چارج لے کر عورت اپنی فطری ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

خالق کو عورت سے یہ مطلوب ہے کہ وہ نسل انسانی کی ابتدائی تربیت کرے۔ اس کے لئے عورت کو فطری طور پر ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو بخوبی طور پر ادا کر سکے۔ عورت کے اندر نرمی اور شفقت اور صبر اور جذباتی تعلق جیسی صفات دی گئی ہیں جو اس کام کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ قدیم زمانہ میں یہ فطری اوصاف ہی کافی تھے کہ عورت اپنے مفوضہ کام کو بخوبی طور پر انجام دے سکے۔ مگر اب جدید حالات میں صرف یہ فطری اوصاف کافی نہیں۔

اب ضرورت ہے کہ عورت باقاعدہ طور پر ڈگری والی تعلیم حاصل کرے۔ وہ جدید علوم سے آشنا

ہو۔ اسی کے ساتھ وہ جدید معنوں میں تعلیمی تربیت (educational training) حاصل کرے۔ وہ ڈگری کے مانے ہوئے معیار پر یہ ثابت کرے کہ وہ اسکول کے بچوں کی تعلیم وتربیت کی اہل ہے۔ وہ آج بھی اپنے اس فریضہ کو ٹھیک اسی طرح ادا کرسکتی ہے جس طرح وہ اس سے پہلے زرعی دور میں کامیابی کے ساتھ ادا کررہی تھی۔

جدید نسلوں کو اخلاقی انارکی (moral anarchy) سے بچانے کی یہی واحد صورت ہے۔ خواتین کو جاننا چاہئے کہ اب ان کا مقام عمل (work place) نہ صحرا ہے اور نہ گھر۔ بلکہ اب وہ بنیادی طور پر اسکول ہے۔ اب ان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی تیاری ان جدید تقاضوں کے مطابق کریں۔ وہ جدید تعلیم حاصل کریں۔ وہ تعلیمی اعتبار سے اپنے آپ کو تربیت یافتہ ٹیچر (trained teacher) ثابت کریں۔ اس طرح خواتین دوبارہ نئے نظام میں معمار انسانیت بن جائیں گی جس طرح اس سے پہلے وہ قدیم نظام میں معمار انسانیت بنی ہوئی تھیں۔

۲۴ اپریل ۲۰۰۴ کو دہلی میں ایک ٹیلی ویژن پروگرام تھا۔ اس پروگرام میں ایک مسلم پروفیسر بھی شامل تھے۔ چائے کی میز پر گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میری زندگی کی تعمیر میں میری ماں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ ۱۹۶۷ میں میں نے میٹرک پاس کیا۔ میرے گھر کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ میں آگے پڑھنا چاہتا تھا مگر میرے باپ نے کہا کہ اب وہ مزید تعلیم کا خرچ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے اب مجھے تعلیم کا خیال چھوڑ کر کوئی معاشی کام کرنا چاہئے۔

مگر میں اپنے آپ کو اس کے لئے تیار نہیں پاتا تھا کہ تعلیم کا سلسلہ چھوڑ دوں۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگلے تعلیمی مرحلہ میں داخلے کی فیس ادا کرنے کے لئے بھی میری جیب میں پیسہ نہیں تھا۔ میری ماں نے میرے شوق کو دیکھ کر کہا کہ میرے تمام زیورات فروخت ہوچکے ہیں۔ میرے پاس اب صرف کان کی ایک بالی موجود ہے وہ میں تم کو دیتی ہوں۔ تم اس کو بیچ کر اس سے اپنی فیس ادا کرو۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ سونے کی اس بالی کو لے کر میں بازار میں گیا۔ وہاں مجھے اس کے ۸۰

روپئے ملے۔ اس روپئے سے میں نے داخلہ کی فیس ادا کی اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران بہت سے اونچ نیچ پیش آئے۔ مگر میری ماں ہر مرحلہ میں میری ہمت بندھاتی رہیں۔ یہاں تک کہ میں نے تعلیم مکمل کرلی اور اب میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں۔

یہ صرف ایک شخص کی کہانی نہیں۔ جس کامیاب آدمی سے بھی آپ پوچھئے وہ بتائے گا کہ میری زندگی کی تعمیر میں میری ماں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میری کامیابی کا کریڈٹ اگر کسی کو جاتا ہے تو وہ صرف میری ماں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت، ماں کے روپ میں ہر انسان کی سب سے بڑی مددگار ہے۔ وہ ہر انسان کی ترقی میں سب سے زیادہ موثر رول ادا کررہی ہے۔ ماں کی حیثیت سے عورت کا یہ کردار اتنا زیادہ عام ہے کہ ہر آدمی اپنے ذاتی تجربہ سے اس کو جانتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ماں ہر جگہ اور ہر دور میں اپنا یہ رول ادا کرتی رہی ہے۔

اسلام اسی فطری حقیقت پر گویا ایک اضافہ ہے۔ اسلام عورت کے اندر ایک آفاقی ذہن پیدا کرتا ہے۔ اسلام کا مدعا یہ ہے کہ عورت صرف معمار فرزند نہ رہے بلکہ وہ معمار انسانیت بن جائے۔ وہ فطرت کی دی ہوئی نسوانی صلاحیت اپنے بیٹے اور بیٹی تک محدود نہ رکھے بلکہ وہ اس کو پوری نوع انسانی کے لئے خیر کا ذریعہ بنادے۔ عورت کو خدا نے معمار انسانیت بنا کر پیدا کیا ہے۔ یہ عورت کا کمتر استعمال ہوگا کہ اس کو صرف معمار فرزند تک محدود کردیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں ڈگری والی تعلیم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہر جگہ جاب کے لیے ڈگری کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس نئی صورت حال نے اسکولی تعلیم (schooling) کی اہمیت بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔ کیوں کہ اسکول کی تعلیم جتنی زیادہ اچھی ہوگی اتنی ہی زیادہ آگے کی تعلیم اچھی ہوسکے گی۔

اس نئی صورت حال نے عورتوں کے لیے مخصوص اسباب سے ایک بہت بڑا جاب مارکیٹ پیدا کردیا ہے۔ اور وہ ٹیچنگ کا کام ہے۔ آج عورتیں بہت بڑے پیمانہ پر ٹیچنگ کے کام میں نظر آتی ہیں۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ عورتیں زیادہ کامیاب اسکول ٹیچر ثابت ہوتی ہیں۔

اس طرح گویا موجودہ زمانہ کی خواتین عملاً اپنے اس مقام عمل (work place) میں پہنچ چکی ہیں جوان کے لیے فطرت نے مقدر کیا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں خواتین اس کام کو زیادہ تر پروفیشن کے طور پر کرتی ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ وہ ٹیچنگ کے اس جاب کو مشن کے طور پر انجام دینے لگیں۔ وہ پروفیشن ٹیچر کے بجائے مشنری ٹیچر بن جائیں اور اس کے بعد انسانی نسل کی تربیت کا وہ کام اپنے آپ ہونے لگے گا جو آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

چند خواتین کی مثال

زیرِ نظر کتاب کا خاص مقصد عورت کے مثبت کردار (positive role) کو بتانا ہے۔ اس مقصد کے لئے کتاب میں نظریاتی ماڈل بھی پیش کئے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ تاریخ کی کچھ عملی مثالیں بھی۔ اب اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ عورت کے بارے میں مصنف نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے وہ اس کا اپنا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ اس سلسلہ میں مجھ کو جن خواتین کا تجربہ ہوا، ان میں سے کچھ خواتین کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

زیب النساء

اس سلسلہ میں پہلا نام میری والدہ زیب النساء کا ہے۔ وہ ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک گاؤں سنجر پور میں انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئیں اور ۸/ اکتوبر ۱۹۸۵ میں دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ جب کہ ان کی عمر سو سال کے قریب ہو چکی تھی۔ میری والدہ کی تعلیم اگرچہ بہت معمولی تھی مگر وہ نہایت ذہین اور جرأت مند خاتون تھیں۔ قدیم خواتین کی طرح تمام شریفانہ اوصاف ان کے اندر مکمل طور پر موجود تھے۔

میری والدہ میں وہ تمام اخلاقی خوبیاں درجۂ کمال میں پائی جاتی تھیں جو قدیم زمانہ کی خواتین کا خاصّہ ہوا کرتی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کے اندر ایک استثنائی صفت موجود تھی جو عام طور پر ماؤں کے اندر نہیں ہوتی۔ اور وہ ہے، اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ پیار (pampering) کا معاملہ نہ کرنا۔ وہ ہم لوگوں کو مارتی نہیں تھیں مگر عام ماؤں والا لاڈ پیار بھی نہیں کرتی تھیں۔ وہ اپنے بارے میں اکثر کہتی تھیں کہ — میں نے اپنے بچوں کو ہمیشہ ڈانٹ کر رکھا۔

والدہ کی یہ دو طرفہ صفت میرے بہت کام آئی۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ وہ اعلیٰ سطح پر میری کردار سازی کر سکیں۔ تعلیم کی کمی کی بنا پر وہ اگرچہ کردار سازی یا کیریکٹر بلڈنگ کے الفاظ سے واقف نہ تھیں۔ مگر یہ صفت فطری طور پر ان کے اندر کامل درجہ میں پائی جاتی تھی۔ اخلاقی معاملات میں وہ نہایت سخت

کے ساتھ میری نگرانی کرتی تھیں۔ انہوں نے تقریباً منصوبہ بند انداز میں میرے اندر اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً محنت اور تواضع کی صفت پیدا کرنے کے لیے انھوں نے دو بکری خریدی اور مجھے اس کے چَرانے کے کام پر لگا دیا۔ والدہ کے اسی مزاج کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ مجھے اپنے بچپن میں یہ نسبت بھی حاصل ہوئی کہ میں نے بکریاں چرائیں۔

میری والدہ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولیں۔ انہوں نے کبھی منافقانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ اصولی معاملات میں ان کا رویہ ہمیشہ غیر مصالحانہ ہوا کرتا تھا۔ وہ سخت محنت کرتی تھیں۔ مگر انھوں نے کبھی کسی سے کسی چیز کو مانگنا پسند نہیں کیا۔ ان کی صاف گوئی کا یہ حال تھا کہ کوئی بھی آدمی انہیں اس سے روک نہیں سکتا تھا کہ وہ بات کو کھلے طور پر اس کی بے آمیز صورت میں بیان کر دیں۔ وہ اخلاقِ فاضلہ کے الفاظ سے نا آشنا تھیں۔ مگر عملاً یہ حال تھا کہ وہ اپنی ساری زندگی اخلاقِ فاضلہ کا پیکر بنی رہیں۔

اپنے مزاج کی بنا پر انہیں ہمارے مادّی مستقبل کی زیادہ پروا نہیں ہوتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، انہوں نے کبھی مجھ سے کمانے کی بات نہیں کی۔ مگر جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے، وہ نہایت سختی کے ساتھ اس کی نگرانی کرتی تھیں۔ وہ رات اور دن میرے اوپر اخلاقی محاسب بنی رہتی تھیں۔ وہ کبھی اس کو برداشت نہیں کرتی تھیں کہ ان کے بچوں کے اندر ادنیٰ درجہ میں بھی پست کرداری جیسی کوئی بات پیدا ہو۔ میرے والد فرید الدین خاں کا انتقال میرے بچپن میں ۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ کو ہوا۔

میں اپنی پیدائش (۱۹۲۴) سے لے کر تقریباً پندرہ سال تک ان کے ساتھ گاؤں میں رہا۔ گویا میری تیاری کی مدت (formative period) پوری کی پوری اپنی ماں کے ساتھ گذری ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ میرے اندر وہ انسانی اوصاف طبیعت ثانیہ کے درجہ میں پیدا ہو گئے جن کو قدیم عربوں میں **المروءۃ** کہا جاتا تھا۔

اسی تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ میں ایک اصول پسند انسان بن گیا۔ جھوٹ بولنا مجھے انسانیت سے کمتر درجہ کی چیز دکھائی دینے لگی۔ دیانت داری (honesty) میرا عمومی مزاج بن گیا۔ حقیقت پسندی میرے

مزاج کا لازمی حصہ بن گئی۔ میں ایک اعتراف پسند انسان بن گیا، ایک ایسا انسان جو بے اعترافی کا تحمل نہ کر سکے۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اپنی والدہ کی طرف سے مجھے اپنے بچپن میں وہ چیز ملی جس کو حدیث میں **خیارکم فی الجاھلیۃ** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

میری والدہ کے اندر جو اخلاقی صفات تھیں وہ قدیم زمانہ میں خواتین کے اندر عام طور پر ہوا کرتی تھیں۔ اس معاملہ میں میری والدہ کی حیثیت کسی استثنائی خاتون کی نہ تھی۔ مگر ایک معاملہ میں وہ ضرور استثنائی خاتون کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ یہ کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ پیار (pampering) کا معاملہ کبھی نہیں کرتی تھیں۔ اپنے بچوں کے ساتھ ان کو وہی محبت تھی جو ہر ماں کو ہوتی ہے۔ مگر وہ اس بات کو بھی جانتی تھیں کہ لاڈ پیار بچوں کو صرف بگاڑتا ہے۔ چنانچہ اپنے بچوں کے ساتھ ان کا معاملہ مکمل طور پر ایک حقیقت پسند ماں جیسا ہوتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں اکثر کہتی تھیں کہ — میں نے اپنے بچوں کو ہمیشہ ڈانٹ کر رکھا۔ میری والدہ کی یہی وہ استثنائی صفت ہے جس نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ میرے لیے ایک کردار ساز ماں کا رول ادا کر سکیں۔

ایک ربانی مِشن کو چلانے کے لیے ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اندر مکمل طور پر غیر مصالحانہ مزاج ہو۔ اس کے اندر کامل حقیقت پسندی ہو۔ اصول کے معاملہ میں اس کی حسّاسیت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہو۔ اس کے اندر ایکسپلائٹیشن کا مزاج بالکل نہ پایا جاتا ہو۔ انسانیت کے حق میں اس کے دل میں شفقت اور خیر خواہی کے جذبات بھرے ہوئے ہوں۔ مادی حقیقتوں کے مقابلہ میں غیر مادی حقیقتیں اس کو زیادہ اہم دکھائی دیں۔ حق کے معاملہ میں وہ کسی کی ملامت کی پروا نہ کرے۔ کوئی بھی مادی انٹرسٹ اسے اُس کے راستہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ لوگوں کے منفی رویہ کے باوجود وہ ہمیشہ مثبت رویہ پر قائم رہے۔ کسی بھی حال میں وہ بے اعترافی کا تحمل نہ کر سکتا ہو۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ والدہ کی تربیت نے میرے اندر مذکورہ صفات بخوبی طور پر پیدا کر دیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، میری والدہ معمولی تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کی زندگی گاؤں کے ماحول میں گذری۔ اس لئے وہ مذکورہ قسم کے اخلاقی اوصاف کی اہمیت کو شعوری طور پر نہیں جانتی

تھیں۔ انھوں نے صرف اپنے پیدائشی مزاج کے تحت میری شخصیت کو اس انداز پر ڈھالنے کی کوشش کی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ اگر والدہ نے اس نہج پر میری شخصیت سازی نہ کی ہوتی تو میں ہرگز اس قابل نہ بنتا کہ میں اس دعوتی اور تعمیری مِشن کو چلاسکوں جس کو میں نے اپنا مقصدِ حیات بنایا ہے۔

الرسالہ مِشن جیسا دعوتی مِشن ہمیشہ اعلیٰ کردار کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ کردار کی دو قسمیں ہیں— مخلصانہ کردار اور منافقانہ کردار۔ منافقانہ کردار کی بنیاد پر ایک سیاسی کاروبار تو کیا جاسکتا ہے مگر ایک سچا مِشن صرف مخلصانہ کردار کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ کردار کے بغیر ایک سچے مِشن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اعلیٰ کردار نہیں تو مِشن بھی نہیں۔

میرے تجربے کے مطابق، ہر ماں امکانی طور پر انھی اوصاف کی حامل ہوتی ہے جن کا ذکر میں نے اپنی ماں کے حوالہ سے کیا ہے۔ مگر ماؤں کی ایک عمومی کمزوری نے انھیں محروم کر دیا کہ وہ اپنی اولاد کے حق میں وہ تعمیری کردار ادا کرسکیں جو میری ماں نے میرے حق میں ادا کیا۔ یہ کمزوری وہی ہے جس کو لاڈ پیار (pampering) کہا جاتا ہے۔ ہر ماں کو اپنے بچہ سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ میری والدہ میں یہ صفت تھی کہ وہ اپنی محبت کو اپنی عقل کے تابع رکھتی تھیں۔ اس لیے وہ لاڈ پیار کی تباہ کن غلطی سے بچی رہیں۔ میرا احساس ہے کہ اگر مائیں صرف اپنی اس کمزوری پر قابو پالیں تو وہ اپنی عمر ہی میں ایک نئی جنریشن پیدا کرسکتی ہیں، ایک ایسی جنریشن جو ایسے انسانوں پر مشتمل ہو جو صالح سماج بنانے کے لئے درکار ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تمام انسان اپنی عمر کے مرحلۂ تیاری (formative period) میں ماؤں کے زیرِ تربیت ہوتے ہیں۔ یہ مائیں ان کو جیسا چاہیں ویسا بنادیں۔ انسانیت کے نظام میں فطرت نے گویا انسان سازی کا چارج ماؤں کے سپرد کیا ہے اور اس کے مطابق انھیں ضروری صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ذاتی طور پر اس حقیقت کا تجربہ کیا ہے۔ میرے نزدیک ہر ماں فطری طور پر ان مطلوب اوصاف کی حامل ہوتی ہے۔ مگر صرف ایک چیز ہے جس نے ماؤں کو اپنے اس تعمیری کردار کی ادائیگی سے محروم کر رکھا ہے، اور وہ ہے ماؤں کا اولاد کے لئے غیر ضروری لاڈ پیار۔

سابعہ خاتون

اس سلسلہ میں دوسرا قابلِ ذکر نام میری اہلیہ سابعہ خاتون کا ہے۔ اب ان کی عمر ۶۷ سال ہوچکی ہے۔ ان کے ساتھ میری شادی ۱۹۴۲ میں ہوئی۔ یہ شادی میرے چچازاد بھائی اقبال احمد سہیل (وفات ۱۹۵۵) نے کرائی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس سال میری شادی ہوئی عین اُسی سال میری زندگی میں ایک طوفانی دور شروع ہوگیا۔ یہ تلاشِ حقیقت کا دور تھا۔ میں حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔ غیر منصوبہ بند انداز میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ تلاش کا یہ دور تقریباً پانچ سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۸ میں میں نے اسلام کو ایک کامل صداقت کے طور پر از سرِ نو دریافت کیا۔

تاہم یہ دریافت میری اہلیہ کے لئے کوئی خوش آئند پیغام نہ تھی۔ میں دوبارہ ایک طویل سرگرمی میں مشغول ہوگیا۔ یعنی میں نے جس سچائی کو پایا ہے اس سچائی کو تمام انسانوں تک پہنچاؤں۔ اس سچائی سے خدا کے تمام بندوں کو باخبر کروں۔ گویا کہ پہلے اگر سچائی کی تلاش نے مجھ کو سراسیمہ کر رکھا تھا تو اب سچائی کو عام کرنے کے جذبہ نے مجھ کو مزید اضافہ کے ساتھ سراسیمگی میں مبتلا کر دیا۔ میری سرگرمیوں کا مرکز عام انسان ہوگیا، نہ کہ محدود طور پر میرے اہل وعیال۔

یہاں دوبارہ ایک ''حادثہ'' پیش آیا۔ جب میں دعوت وتبلیغ کے کام میں سرگرم ہوا تو جلد ہی میں نے دریافت کیا کہ مدرسہ کی روایتی تعلیم نے مجھ کو جو صلاحیت دی ہے اس کے ذریعہ میں صرف ''عوام'' کے درمیان اپنا دعوتی کام کرسکتا ہوں۔ جہاں تک ''خواص'' کا تعلق ہے، وہ ایک غیر روایتی کام ہے اور میں ابھی اس کے لیے نااہل (incompetent) ہوں۔ خواص میں کام کرنے کے لئے مجھے مزید استعداد درکار ہے۔ اور وہ ہے، انگریزی زبان میں بخوبی لیاقت پیدا کرنا اور جدید افکار کا گہرا مطالعہ کرنا۔

اس احساس نے مجھے دوبارہ ایک نئے، مشکل تر کام میں لگا دیا۔ میں انگریزی زبان اور انگریزی علوم کے حصول میں دیوانہ وار مصروف ہوگیا۔ اس زمانہ میں میرا حال یہ تھا کہ سڑک پر چلتے

ہوئے میں اپنے ہاتھ میں کوئی انگریزی کتاب لیے رہتا تھا اور ماحول سے بے خبر ہو کر چلتے ہوئے اس کو پڑھتا رہتا تھا۔ روڈ ریڈنگ کی یہ دیوانگی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ میری ماں اور میرے بڑے بھائی یہ کہا کرتے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ شخص سڑک پر چلتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکرا جائے گا اور اس طرح وہ اپنا خاتمہ کرلے گا۔

اس طرح شادی کے بعد ہی سے میرا یہ حال ہوا کہ میں اپنی اہلیہ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ میرے بچے پیدا ہو گئے اور کسی قسم کی معاشی بنیاد ابھی تک میں نے نہیں بنائی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک دن میں باہر سے چل کر گھر کے اندر آیا۔ اس وقت میری اہلیہ میرے بڑے بھائی کے گھر (باقی منزل) کے ایک کمرہ میں رہتی تھیں۔ اعظم گڑھ میں میری اہلیہ کی ایک سہیلی تھیں جن کا نام رضیہ بیگم تھا۔ میں کمرہ میں داخل ہوا تو میری اہلیہ نے کہا کہ رضیہ کہتی ہیں کہ تم لوگ اس طرح کب تک رہو گے۔ تمہارے بچوں کا معاشی مستقبل کیا ہوگا۔ میری زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے: رضیہ سے کہہ دو کہ یہ کشتی اپنے تمام سواروں سمیت بس اللہ کے حوالے ہے۔

میری زندگی کا جو اسٹائل بنا، اس کی سب سے زیادہ قیمت میری اہلیہ کو دینی پڑی۔ شادی شدہ زندگی کبھی میری دلچسپیوں کا مرکز نہ بن سکی۔ مجھے ہمیشہ کچھ اور ہی چیزوں کی دھن لگی رہتی تھی۔ میرا ذہنی ارتکاز (concentration) مکمل طور پر کسی اور طرف تھا۔ اس دھن کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں اس مجتہدانہ مشن کو لے کر کھڑا ہو سکا جس کا کوئی نمونہ میرے آس پاس موجود نہ تھا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ یوروپی کولونیلزم سے لے کر امریکا کے نیو ورلڈ آرڈر تک مسلمان جس ناموافق صورت حال سے دوچار ہوئے اس نے اس مدت میں پیدا ہونے والے تمام علماء اور مصلحین کو منفی طرز فکر میں مبتلا کر دیا۔ ایسے حالات میں مجھے اسلام کے اس مثبت تصور کو دوبارہ دریافت کرنا تھا جو تقریباً تین سو سال سے منفی تقریروں اور تحریروں کے انبار میں چھپ گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر ڈاکٹر یوسف القرضاوی تک تمام علماء جہاد کو قتال کے ہم معنٰی بتاتے رہے ہیں۔ ایسی حالت میں مجھے اس مشکل کام کو کرنا پڑا کہ میں جہاد فی سبیل اللہ کو پرامن دعوتی جدوجہد

کے مفہوم میں دریافت کروں۔ تین سو سال کے حالات نے تمام علماء اور رہنماؤں کو غیر مسلموں کے خلاف نفرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب مجھے یہ کرنا پڑا کہ نفرت کے سمندر میں غوطہ لگا کر محبت انسانی کے گم شدہ موتیوں کو دریافت کروں۔ جدید سائنس کے ذریعہ موجودہ زمانہ میں نیا طاقت ور علم کلام وجود میں آیا تھا مگر اہل مغرب سے نفرت کے نتیجہ میں ہمارے علماء کے لئے وہ اب تک غیر دریافت شدہ بنا ہوا تھا۔ مجھے یہ کرنا تھا کہ میں اس غیر دریافت شدہ متاع کو دریافت کر کے اس کو استعمال کروں۔ مجھے دنیا میں بے آمیز دعوت کا کام کرنا تھا۔ یہ کام اتنا نازک ہے کہ اس میں ادنیٰ جھکاؤ (tilt) بھی داعی کو دہرا عذاب کے رسک میں مبتلا کر دیتا ہے (الاسراء ۷۴)۔ ایسی حالت میں میرے لئے بیوی بچوں کے بارے میں سوچنے کا موقع بھی نہیں تھا چہ جائیکہ میں اُن کے لئے عملاً کچھ کروں۔

اس طویل اور جاں گسل منصوبہ کو جاری رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ہو جو اس کی قیمت ادا کرے۔ میری اہلیہ نے یہی قیمت ادا کی۔ انہوں نے نا قابل برداشت کو برداشت کیا۔ وہ پوری عمر صبر کے اصول پر قائم رہیں، اور کبھی شکایت کا ایک لفظ منھ سے نہیں نکالا۔ حالاں کہ میرا حال یہ تھا کہ تقریباً پوری عمر میں نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا۔ شاید قارئین کو یقین نہیں آئے گا کہ میں نے ۱۹۴۲ سے لے کر اب تک اپنی اہلیہ کے لئے ایک جوڑا کپڑا بھی نہیں بنایا۔ کبھی ان کے لئے جوتا یا چپل نہیں خریدا۔ ان کی مادی ضرورتوں کے بارے میں مکمل طور پر غیر جانب دار بنا رہا۔ کسی صاحب مشن کے لیے اس قسم کا یکطرفہ تعاون بہت قیمتی ہے، اور ایسا تعاون کسی کو صرف ایک عورت ہی سے مل سکتا ہے۔

میری اہلیہ کامل صبر کا ثبوت دیتے ہوئے میرے لیے ایک نو پرابلم خاتون بن گئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقینی تھا کہ میرا سارا منصوبہ نا تمام رہ جاتا۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں کی طرح، میں بھی ایک حیوان کاسب بن جاتا۔ اور پھر اسی حالت میں ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا جہاں سے دوبارہ واپس آنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

فریدہ خانم

اس سلسلہ میں تیسرا نام میری لڑکی فریدہ خانم کا ہے۔فریدہ خانم کی پیدائش ۲ رمئی ۱۹۵۲ کو اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ان کی صحت اگر چہ بچپن سے اچھی نہ تھی مگر انھوں نے غیر معمولی محنت کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پرائیوٹ طور پر ہائی اسکول اور پری یونیورسٹی کے امتحانات پاس کئے۔ پھر انہوں نے دلی کالج (نئی دہلی) سے بی اے (انگلش آنرس) کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) سے اسلامیات میں ایم اے کیا۔ اور پھر جامعہ ملیہ ہی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں اسلامک اسٹڈیز کے ڈپارٹمنٹ میں ریڈر ہیں۔

فریدہ خانم کا حصہ (contribution) ہمارے مشن میں اتنا زیادہ ہے کہ شاید اس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ۱۹۷۶ میں جب میں نے ماہنامہ الرسالہ جاری کیا تو مضامین کی تیاری کے سوا دوسرے اکثر کاموں کو انھوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ ہمارے اس مشن سے پوری طرح جڑی ہوئی ہیں۔ جہاں تک الرسالہ مشن کے انتظامی معاملات اور اس کو عالمی سطح پر پھیلانے کا معاملہ ہے، اُس کو میرے لڑکے ثانی اثنین خاں نے بخوبی طور پر سنبھال رکھا ہے اور تحریری امور میں معاونت کا کام فریدہ خانم نے۔ یہاں میں صرف چند مثالوں کا ذکر کروں گا تا کہ فریدہ خانم کے ان کاموں کا اندازہ ہو سکے جو انھوں نے قربانی کی سطح تک جا کر انجام دئے ہیں۔

میرا تجربہ ہے کہ جب بھی کسی شخص نے میرے مشن میں کوئی تعاون کیا تو اس نے یہ ضرور چاہا کہ اس کا نام لوگوں کے علم میں آئے۔ اپنے تجربہ کے مطابق، میں نے فریدہ خانم میں وہ انوکھی صفت پائی ہے جس کو ایک مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: نیکی کر دریا میں ڈال۔ کسی مِشن میں بے غرضانہ تعاون شاید عورت ہی کے لئے ممکن ہے۔ یہ مزاج شاید مرد کو بہت کم دیا گیا ہے۔

میری کتاب مذہب اور جدید چیلنج پہلی بار علم جدید کا چیلنج کے نام سے ۱۹۶۴ میں لکھنؤ سے

چھپی۔ یہ کتاب کافی مقبول ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔عربی زبان میں یہ کتاب **الاسلام یتحدی** کے نام سے شائع ہوئی۔

لوگوں کا مسلسل اصرار تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں شائع کیا جائے۔کئی لوگوں نے بطور خود اس کا انگریزی ترجمہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہ ناکام رہے۔اس سلسلہ میں اہم سوال یہ تھا کہ اس کتاب میں کثرت سے انگریزی کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ یہ تمام اقتباسات اردو ترجمہ کی صورت میں تھے۔دوسری زبانوں میں ترجمہ کے وقت کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔کیوں کہ مترجمین کو خود بھی صرف ترجمہ کرنا تھا۔لیکن انگریزی ترجمہ کی صورت میں ضروری تھا کہ ان تمام اقتباسات کی اصل موجود ہوں، کیوں کہ انگریزی کا دوبارہ انگریزی میں ترجمہ کرنا درست نہ تھا۔

کئی انگریزی داں افراد جنھوں نے کتاب کا ترجمہ کرنا چاہا انھوں نے مجھ سے اصل انگریزی عبارت طلب کی۔مگر مشکل یہ تھی کہ خود میرے پاس اصل کتابیں موجود نہ تھیں۔ میں نے یہ کتاب مذہب اور جدید چیلنج لمبی مدت کے دوران لکھی تھی۔اس کے لئے میں نے کئی سفر بھی کئے تھے۔مختلف مقامات کی لائبریریوں یا مختلف اہل علم کے ذاتی کتب خانوں سے کتابیں لے کر اپنی کتاب تیار کی تھی۔ اب مجھے یہ بھی یاد نہ تھا کہ میں نے کون سی کتاب کہاں سے حاصل کی تھی۔ یہ معاملہ اتنا سنگین تھا کہ ذاتی طور پر میں نے سمجھ لیا تھا کہ میری اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کبھی نہ ہو سکے گا۔

فریدہ خانم نے میری فرمائش کے بغیر خود ہی خاموشی کے ساتھ یہ کام شروع کیا۔انھوں نے رات دن ایک کر کے مختلف لائبریریوں میں ان کتابوں کی تلاش شروع کر دی۔علی گڑھ کی آزاد لائبریری، دہلی کی پبلک لائبریری، دہلی یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں کی لائبریری میں انھوں نے لمبی مدت تک اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ انھوں نے تمام کتابوں کے اصل اقتباسات پورے حوالے کے ساتھ حاصل کر لیے۔

غالباً اس معاملہ میں ان کو پہلا خیال اس وقت آیا جب کہ مسٹر اکرام الدین احمد (IAS) کی طرف سے ایک لمبی فہرست ملی۔انھوں نے میری کتاب مذہب اور جدید چیلنج کا مطالعہ کر کے ان تمام

کتابوں کی ایک مکمل فہرست کئی صفحات میں ٹائپ کرکے بھیجی۔ انھوں نے یہ فہرست اس لئے بھیجی تھی کہ میں انہیں یہ تمام کتابیں فراہم کروں۔ میں یہ کتابیں ان کو فراہم نہ کرسکا مگر ان کی بنائی ہوئی یہ فہرست فریدہ خانم کے لئے ایک محرک بن گئی۔ انھوں نے اس فہرست کو لے کر تمام لائبریریوں میں چھان بین شروع کردی۔ آخر کار انھوں نے تمام انگریزی اقتباسات حاصل کرلیے اور پھر ان اقتباسات کو شامل کرتے ہوئے پوری کتاب کا ترجمہ تیار کرلیا۔ یہ ترجمہ کئی مراحل سے گزرا یہاں تک کہ وہ مکمل ہوکر پہلی بار ۱۹۸۵ میں دہلی سے چھپا۔ اس کتاب کا نام گاڈ ارائزز (God Arises) ہے اور وہ ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ بلاشبہ بے غرضانہ تعاون کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ اس قسم کا کامل بے غرضانہ تعاون شاید ایک عورت ہی کرسکتی ہے۔ ایسے بے غرضانہ تعاون کے لئے جن لطیف صلاحیتوں کی ضرورت ہے، وہ شاید خالق نے مرد کو کم دئے ہیں۔ یہ انوکھی صفت خصوصی طور پر شاید صرف عورت کا حصہ ہے۔

دوسرا واقعہ جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ سوئزرلینڈ کے ایک سفر کے دوران جولائی ۲۰۰۲ میں پیش آیا۔ مختلف مغربی ملکوں کے تعاون سے ایک انٹرنیشنل ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس ادارہ کا نام نیوکلیر ڈس آرمامنٹ فورم (Nuclear Disarmament Forum) ہے۔ اس ادارہ کے تحت سوئزرلینڈ کے تاریخی شہر زُگ (Zug) میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی جس میں مختلف ملکوں کے پروفیسر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بلائے گئے۔ ان کی دعوت پر میں بھی اس کانفرنس میں شریک تھا۔

۲۹ جولائی کی صبح کو صدر کانفرنس آندرے بیکوف نے اعلان کیا کہ ہم کو انٹرنیشنل پیس کے موضوع پر ایک ڈاکومنٹ کی ضرورت ہے۔ اس کو ہم مختلف زبانوں میں شائع کرکے پوری دنیا میں پہنچائیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے شرکاء کانفرنس کے تین گروپ بنائے۔ انھوں نے کہا کہ آپ میں سے ہر ایک الگ الگ حلقہ میں بیٹھے اور اپنا اپنا ڈاکومنٹ بنائے۔ اس میں سے ایک ڈاکومنٹ کو منتخب کرکے ہم کل صبح کے اجلاس میں پیش کریں گے۔ چنانچہ ہر گروپ نے دو دن کی متحدہ کوشش سے

اپنا اپنا ڈاکومنٹ بنایا اور پھر اسے آندرے بیکوف کے حوالہ کردیا۔

رات کو تقریباً دس بجے جب کہ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کررہا تھا، اچانک آندرے بیکوف میرے کمرہ میں آئے۔ وہ غمگین دکھائی دیتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ تینوں گروپ نے اپنا اپنا ڈاکومنٹ مجھے دیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی مجھے پسند نہیں آیا۔ میں سخت پریشان ہوں کہ کل صبح کے اجلاس میں میں لوگوں کے سامنے کیا چیز پیش کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ پریشانی کے عالم میں میں یہاں کے چرچ میں چلا گیا۔ وہاں میں نے دعائیں کیں۔ آخر کار میرے دل میں آیا کہ یہ کام صرف آپ کر سکتے ہیں۔ آپ میرا مطلوب ڈاکومنٹ تیار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں صبح کو دوبارہ آپ سے ملوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت تک آپ یہ ڈاکومنٹ تیار کر چکے ہوں گے۔ میں حیرانی کے عالم میں تھا اور ان کا کوئی جواب بھی نہیں دے پایا تھا۔ وہ مجھے اسی حال میں چھوڑ کر میرے کمرہ کے باہر چلے گئے۔

میری لڑکی فریدہ خانم بھی میرے ساتھ اس سفر میں گئی تھیں۔ وہ اسی ہوٹل کے دوسرے کمرہ میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں نے ٹیلی فون کر کے انہیں بلایا۔ وہ آئیں تو میں نے ان سے آندرے بیکوف کا قصہ بیان کیا۔ میں نے کہا کہ بڑے بڑے عالمی پروفیسر اور انگریزی کے ماہرین جس کام کو نہ کر سکے اس کو میں کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں اس معاملہ میں اپنے آپ کو بالکل عاجز محسوس کرتا ہوں۔ مگر فریدہ خانم کا ردعمل بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس پوری ایک رات ہے۔ ہم خدا سے دعا کریں گے اور رات بھر جاگ کر اس کو تیار کریں گے۔ ان کے ایک گھنٹہ کے اصرار کے بعد آخر کار میں راضی ہو گیا۔

اس کے بعد میں فریدہ خانم کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پہلے میں نے ڈاکومنٹ کے بارہ میں ان سے ڈسکشن کیا۔ آخر کار اس کا ایک واضح خاکہ بن گیا۔ اب فریدہ خانم نے اس کو لکھنا شروع کیا۔ میں اپنے خیالات کچھ انگریزی میں اور کچھ اردو میں بولتا تھا اور فریدہ خانم اس کو انگریزی زبان میں لکھتی جارہی تھیں۔ اس عمل میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ آخر کار چند صفحہ پر مشتمل اس کا مضمون تیار

ہو گیا۔ اگرچہ جب وہ تیار ہوا تو فجر کا وقت شروع ہو چکا تھا۔

اس کے بعد ہم دونوں نے فجر کی نماز پڑھی۔ صبح کی چائے کے بعد فریدہ خانم نے یہ کیا کہ انھوں نے کانفرنس کے آفس میں جا کر تین صفحے کے ڈاکومنٹ کو کمپیوٹر پر ٹائپ کیا۔ اور پھر پرنٹ آؤٹ کے ذریعہ اس کی چند کاپیاں نکالیں اور اسی وقت اس کو آندرے بیکوف کے حوالہ کر دیا۔

ڈاکومنٹ کو پڑھنے کے بعد آندرے بیکوف دوبارہ میرے کمرہ میں آئے۔ کل کے برعکس، آج وہ بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ڈاکومنٹ کی ایک کاپی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں ایسا ہی ڈاکومنٹ چاہتا تھا۔ اب میں اس ڈاکومنٹ کو آج کے اجلاس میں پیش کروں گا اور اس کو منظور کروا کر ساری دنیا میں اس کو پھیلاؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ پیس کے موضوع پر اب تک میں نے اس سے واضح کوئی ڈاکومنٹ نہیں دیکھا۔

یہ ڈاکومنٹ میری ۱۳۶ صفحہ کی کتاب آئیڈیالوجی آف پیس (شائع شدہ ۲۰۰۳) میں شامل ہے۔ یہی وہ ڈاکومنٹ تھا جو ابتدائی طور پر اس کا ذریعہ بنا کہ امن عالم کے بارے میں میرے نظریات اور میری کوششیں انٹرنیشنل سطح پر نمایاں ہوں۔ اس کے بعد اس سلسلہ میں مزید واقعات ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۲ کو سوئزرلینڈ میں مجھے پیس کا انٹرنیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ سابق روسی صدر میخائل گورباچوف نے دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل سفرنامہ سوئزرلینڈ مطبوعہ ماہنامہ الرسالہ اگست ۲۰۰۳ میں دیکھی جا سکتی ہے — فریدہ خانم کا یہ بے غرضانہ کنٹری بیوشن قدرت کے اس انوکھے معجزہ کو بتاتا ہے جو اس نے عورت کی شخصیت میں فطری طور پر رکھ دیا ہے۔

فریدہ خانم کا میری زندگی میں جو حصہ ہے اس کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق روزانہ کی زندگی سے ہے۔ یعنی علمی اور دینی موضوعات پر ڈسکشن کرنا۔ یہ ڈسکشن کوئی سادہ چیز نہیں۔ وہ فکری ارتقاء کے عمل (process) میں لازمی جزء کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ میں کبھی جمود ذہنی کا شکار نہیں ہوا۔ میرے اندر فکری ارتقاء مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس فکری ارتقاء کے جو وسائل ہیں ان میں سے ایک وسیلہ بلاشبہ فریدہ خانم کے ساتھ میرا وہ علمی ڈسکشن ہے جو بلاناغہ ہر روز جاری رہتا ہے۔ اس

اعتبار سے میں فریدہ خانم کو اپنا فکری معاون (intellectual assistant) کہتا ہوں۔

اس معاملہ کی ایک مثال زیرِ نظر کتاب (عورت معمارِ انسانیت) میں بھی موجود ہے۔ اس کتاب کو تیار کرنے کے بعد میں نے اس کے آخر میں ایک مختصر تحریر لکھی جو کتاب کے آخر میں ڈیڈی کیشن (dedication) کے عنوان سے شامل ہے۔ اس تحریر میں میں نے لکھا تھا کہ ہاجرہ ام اسماعیل نے قدیم دور میں ایک قربانی دی جس کے نتیجہ میں انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب ضرورت ہے کہ دوبارہ ایک عورت اُٹھے جو ہاجرہ کا رول ادا کرے...

یہ تحریر تیار کرنے کے بعد میں نے حسب معمول اس کو فریدہ خانم کو دکھایا۔ فریدہ خانم نے اس کو پڑھنے کے بعد کہا کہ دوسرے دور کے کارنامہ کے لئے صرف ایک عورت کی بات لکھنا ٹھیک نہیں۔ بہتر ہے کہ اس کو عام بنا دیا جائے۔ تاکہ ہر عورت اپنے آپ کو اس کا مخاطب سمجھے۔ ہر عورت یہ سمجھے کہ مجھے بھی یہ رول ادا کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے عبارت میں ترمیم کرکے اس کو فریدہ خانم کے مشورہ کے مطابق کر دیا۔

میرے تجربہ کے مطابق، اس قسم کے مفید ڈسکشن کے لیے بھی عورت بے حد موزوں ہوتی ہے۔ اپنی مختلف فطری خصوصیات کی بنا پر وہ اس کام کو نہایت بہتر طور پر کرسکتی ہے۔ فریدہ خانم لمبی مدت تک جس طرح الرسالہ مشن سے جڑی رہیں وہ ان کے لئے کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مدت میں ان کے سامنے غیر معمولی رکاوٹیں آئیں، انہیں انتہائی سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا، اس کے باوجود مشن کے ساتھ ان کی وابستگی کم نہ ہوسکی۔ فریدہ خانم کے اس تجربہ میں مجھے عورت کی ایک انتہائی اہم صفت دریافت ہوئی اور وہ اٹوٹ وفاداری ہے۔ کسی مقصد کے ساتھ تعلق اگر صرف عقلی بنیاد پر ہو تو وہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عقلی اطمینان کے علاوہ مقصد کے ساتھ گہری قلبی وابستگی بھی ضروری ہے۔ یہی قلبی وابستگی اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ شکایتوں کے باوجود مقصد کے ساتھ تعلق آخر تک قائم رہے۔

اصل یہ ہے کہ عورت فطری طور پر ایموشنل (emotional) ہوتی ہے۔ یہ صفت مرد کے اندر

نسبتاً کم پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی خاص مانع سبب نہ ہو تو عورت کو بہت جلد مقصد یا مشن کے ساتھ جذباتی لگاؤ (emotional attachment) قائم ہو جاتا ہے۔ یہی جذباتی لگاؤ اس کو مقصد کے ساتھ مستقل طور پر جوڑے رہتا ہے۔ یہ بے غرضانہ تعلق کسی مقصد کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے، اور اس قسم کا بے غرضانہ تعلق عورتوں کے اندر مردوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

میرے علم کے مطابق، ہر عورت امکانی طور پر وہی ہے جس کا تجربہ میں نے فریدہ خانم کی صورت میں کیا۔ ہر عورت پیدائشی طور پر فریدہ جیسی ہی ہے۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ہر عورت فریدہ جیسی خاتون نہیں بن پاتی۔ تاہم اس کی ذمہ داری تمام تر مرد کے اوپر ہے۔ مردوں کا عام طور پر یہ حال ہے کہ وہ عورت کو بس تفریح یا گھر داری کی چیز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے عورت کے فطری امکان (potential) کو دریافت نہیں کیا۔ اور جس چیز کو آپ دریافت نہ کرسکیں اس کو آپ استعمال بھی نہیں کر سکتے۔

ہر مرد کے لیے عورت ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ مگر یہ سرمایہ بالقوہ صورت میں ہے۔ یہ مرد کا کام ہے کہ وہ اس بالقوہ کو دریافت کر کے اسے بالفعل تک پہنچائے۔ وہ فطرت کے امکان کو واقعہ کی صورت میں ڈھال لے۔

مرد کی اس کمزوری کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلسل طور پر بے فائدہ مشغولیت (idle business) میں لگا رہتا ہے اور عورت کو بھی اسی میں مشغول رکھتا ہے۔ شاپنگ، آؤٹنگ، سوشلائزنگ اور پارٹیاں وغیرہ، بلاشبہ وقت کا بے فائدہ استعمال ہیں۔ مرد یہ کرتا ہے کہ وہ عورت کو انہیں بے فائدہ سرگرمیوں میں مشغول رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کو کچھ اور کرنے یا سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ دبئ میں ایک لائق خاتون کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصّہ بس کھانے پینے کے انتظام میں صرف کرتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا:

you are under-using your potential

بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ مذکورہ خاتون کے اس کم تر استعمال کی ذمہ داری ان کے شوہر کے اوپر ہے۔

دیگر خواتین

میرے تجربہ کے مطابق، عورت دعوتی کام کے لئے، خاص طور پر موجودہ زمانہ میں، بے حد موزوں ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ کسی مرد کے سامنے جب کوئی بات کہی جائے تو اس کے اندر فوراً ایگو (ego) کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے اور داعی کے درمیان وہ نفسیات ابھر آتی ہے جس کو اَنا کا ٹکراؤ (ego clash) کہا جاتا ہے۔ یہ نفسیات اس کے لئے حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ مگر جب دعوت دینے والی شخصیت ایک عورت ہو تو یہ نفسیات بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ سننے والے معتدل انداز میں کہی ہوئی بات کو سن لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس پر غور کرنے کے لئے مجبور پاتے ہیں۔

اس طرح کی بہت سی خواتین ہیں جو اپنے اپنے انداز میں مختلف ملکوں میں کام کر رہی ہیں اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہیں۔ ان میں سے کچھ خواتین کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ مثلاً کراچی میں ڈاکٹر فرحت نسیم ہاشمی، دبئی میں قدسیہ سید، دہلی میں غزالہ جنگ، بنگلور میں فاطمہ سارہ، ڈھاکہ میں سیدہ ربابہ عبدالرحمٰن، حیدرآباد میں ذکیہ کوثر، وغیرہ۔

ڈاکٹر فرحت نسیم ہاشمی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ عربی اور انگریزی زبان بھی بخوبی جانتی ہیں۔ انھوں نے کراچی میں الہدیٰ انٹرنیشنل کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کے تحت وہ خواتین کو باقاعدہ نظام کے تحت اسلامیات کی تعلیم دیتی ہیں۔ اس ادارہ سے جو خواتین تربیت پا کر نکلتی ہیں وہ دوبارہ اپنے اپنے مقامات پر اسی ڈھنگ پر تعلیم وتربیت کا کام شروع کر دیتی ہیں۔ اس طرح الہدیٰ انٹرنیشنل کا کام وسیع پیمانہ پر پھیل گیا ہے۔

فرحت نسیم ہاشمی کے اندر تقریر کا بھی اچھا ملکہ ہے۔ ان کے شوہر پروفیسر محمد ادریس نے بتایا کہ فرحت نسیم ہاشمی کے تقریری پروگراموں میں عورتیں اتنی بڑی تعداد میں آتی ہیں جیسے کہ لوگ سیاسی جلسوں میں آیا کرتے ہیں۔

فرحت نسیم ہاشمی کی تقریریں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں درس قرآن کا ایک موثر انداز اختیار کیا ہے۔ اپنے درس میں پہلے وہ قرآنی آیات کے لفظ لفظ کا ترجمہ کرتی ہیں تاکہ

سننے والا ایک ایک لفظ کا مطلب سمجھ لے۔ اس کے بعد وہ اپنے سادہ اور دل نشیں انداز میں زیر درس آیتوں کی تشریح کرتی ہیں۔ سننے والے پورے دھیان کے ساتھ ان کی تقریر کو سنتے ہیں اور اس سے اثر لیتے ہیں۔ درس قرآن سے متعلق ان تقریروں کے آڈیو ٹیپ تیار کر لئے گئے ہیں۔ یہ آڈیو ٹیپ بڑے پیمانہ پر پھیل گئے ہیں۔ ہر جگہ ان کو بڑے شوق کے ساتھ سنا جاتا ہے۔

فرحت نسیم ہاشمی کی تقریریں سیاست اور ٹکراؤ کی باتوں سے مکمل طور پر خالی ہوتی ہیں۔ یہ ٹیپ خالص تعمیری اور دعوتی انداز کے ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے ذریعہ لوگوں میں خاموشی کے ساتھ ایک فکری انقلاب آرہا ہے۔

دہلی میں میں نے جنوری ۲۰۰۱ سے ایک خاص پروگرام شروع کیا ہے۔ اس کو ہم اسپریچول کلاس (spiritual class) کہتے ہیں۔ یہ ایک ہفتہ وار کلاس ہے جس کا مقصد روحانیت کو اور اسلام کو مثبت انداز میں سمجھنا ہے۔ اس کلاس میں زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان شریک ہوتے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ کئی ہندو خواتین بھی پابندی کے ساتھ شرکت کرتی ہیں۔ مثلاً پریا ملک، استھی ملہوترہ، منجو ورمانی، وغیرہ۔

یہ وہ خواتین ہیں جو ہندو خاندان میں پیدا ہوئیں۔ پھر اُنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ تاہم اُن کے اندر سچائی کی تلاش کا جذبہ تھا جو فطری طور پر ہر ایک کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت اُنہوں نے ہماری کلاس میں آنا شروع کیا۔ چند سال کے تجربہ کے دوران میں نے پایا ہے کہ یہ خواتین نہایت دھیان کے ساتھ میری باتوں کو سنتی ہیں۔ وہ مردوں سے زیادہ ریسیپٹیو (receptive) ثابت ہوئی ہیں۔

ہماری کلاس میں آنے سے پہلے یہ خواتین اپنے ماحول کے اثر سے اسلام کے خلاف منفی ذہن رکھتی تھیں۔ اُن کے لیے یہ ناقابلِ تصور تھا کہ اسلام ہی وہ کامل سچائی ہے جسے ان کی فطرت تلاش کر رہی ہے۔ مگر چند سال تک مسلسل ہمارے ہفتہ وار کلاس میں شرکت کے بعد اُن کی سوچ بدل گئی۔ اُن کے دل نے پوری گہرائی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اسلام ہی وہ سچائی ہے جس کو ان کی فطرت تلاش کر رہی ہے۔

اس تجربے سے مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی جس کو میں نے اِس سے پہلے نہ سنا تھا اور نہ پڑھا تھا، وہ یہ کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان، لڑکے اور لڑکیاں دونوں، بظاہر غیر مذہبی معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں 'غیر مذہبی' نہیں ہیں۔ زیادہ صحیح لفظوں میں وہ 'غیر روایتی' ہیں۔ اُن کے گھر اور ان کے ماحول نے اُن کے اندر اپنے آبائی مذہب کے لیے جو عقیدت پیدا کی تھی، اُس کو جدید انگریزی تعلیم نے ختم کر دیا، گویا کہ ان کی فطرت کے اوپر جو روایتی پردہ پڑ گیا تھا، وہ ہٹ گیا اور وہ اپنی اصل فطرت کے قریب آ گیے۔

اِس تجربے سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ ماڈرن ایجوکیشن کے ادارے اپنی حقیقت کے اعتبار سے 'قتل گاہ' نہیں ہیں، بلکہ وہ تطہیر ذہن کے ادارے ہیں۔ اِس نتیجے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دراصل ڈی کنڈیشننگ کے ادارے (institutions of deconditioning) ہیں۔ ذہنی تطہیر کے اِس عمل کی بنا پر ایسے لوگ اِس قابل ہو گیے ہیں کہ وہ کسی بات کو زیادہ کھلے ذہن کے ساتھ سمجھ سکیں۔

ایک حدیث کے مطابق، ہر پیدا ہونے والا اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اُس کو اس کے والدین اپنے اپنے مذہب میں ڈھال لیتے ہیں (**كلّ مولود يولد على الفطرة، فأبواه يهوّدانه، أو ينصّرانه، أو يمجّسانه، البخاری**)۔ یہ ایک مذہبی کنڈیشننگ کا معاملہ ہے۔ یہ مذہبی کنڈیشننگ دعوتِ حق کے مشن کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کنڈیشننگ کی ڈی کنڈیشننگ دعوت کی کامیابی کا پہلا مرحلہ ہے۔ موجودہ سیکولر تعلیم کا نظام، ڈی کنڈیشننگ کے اِسی عمل کو انجام دے رہا ہے۔ گویا کہ جن نوجوانوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ جدید تعلیم کے بعد وہ مذہب سے پھر گیے ہیں، برعکس طور پر جدید تعلیم نے اُن کو حقیقی مذہب سے قریب کر دیا ہے۔ یہ ایک نیا امکان ہے جو جدید تعلیم نے پیدا کیا ہے۔ اِس امکان کو استعمال کرنا، دعوتی منصوبہ بندی کا پہلا اصول ہے۔

قرآن میں فطرت کا یہ اصول بتایا گیا ہے کہ ناپسندیدہ صورت حال میں بھی ایک موقع موجود رہتا ہے۔ (**عسىٰ أن تكرهوا شيئًا وهو خير لكم، البقرة: 216**) موجودہ تعلیمی نظام کا یہ پہلو اِسی فطری قانون کی ایک مثال ہے۔

مذکورہ خواتین جو ہمارے ہفتہ وار اسپریچول کلاس میں آتی ہیں، اب انہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوہ ورک بھی شروع کردیا ہے۔ وہ حسب موقع لوگوں کے سامنے حق کا پیغام پہنچاتی ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کی بیگ میں ہمارے یہاں کے چھپے ہوئے پمفلٹ موجود رہتے ہیں۔ یہ خواتین ابتدائی تعارف کے بعد یہ کتابیں لوگوں کو پڑھنے کے لیے دے دیتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اُن کا ٹیلی فون نمبر لے لیتی ہیں اور اپنا ٹیلی فون نمبر اُنہیں دے دیتی ہیں۔ تا کہ آئندہ دعوتی عمل کا تسلسل جاری رہے۔ میں اپنے تجربہ کے مطابق، یہ کہہ سکتا ہوں کہ عام مردوں کے مقابلہ میں ایک تعلیم یافتہ خاتون شاید زیادہ بہتر دعوتی کام کرسکتی ہے۔

اسلام کے دور اول میں یہ ہوا کہ عورتوں کے مقابلہ میں مردوں نے زیادہ بڑے کارنامے انجام دیے۔ مگر موجودہ حالات کی نسبت سے میرا احساس یہ ہے کہ اسلام کے دور ثانی میں شاید مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ بڑے کارنامے انجام دیں گی۔ اسلام کی دعوت کو آج انقلاب تک پہنچانے کے لیے شاید یہی مقدر ہے کہ عورتیں اس میں بنیادی کردار ادا کریں۔ تاریخ کا اشارہ بظاہر ایسا ہی بتا رہا ہے۔

عورت عصر جدید میں

اکثر بڑے واقعات کے پیچھے کوئی عورت موجود ہوتی ہے، کبھی براہ راست طور پر اور کبھی بالواسطہ طور پر۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ہر بڑی چیز کے آغاز میں کسی عورت کا ہاتھ ہے:

There is a woman at the beginning of all great things.

اس معاملہ کی شاید سب سے بڑی تاریخی مثال ہاجرہ زوجۂ ابراہیم کی ہے۔ ہاجرہ نے اپنی بے مثال قربانی کے ذریعہ تاریخ بشری میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس کے اثرات ساری دنیا میں محسوس کئے گئے۔

چار ہزار سال پہلے دنیا کا نقشہ اس سے بالکل مختلف تھا جو آج ہمیں نظر آتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں شرک (بت پرستی) کا غلبہ تھا۔ صدیوں کے عمل سے شرک نے ایک مکمل تمدن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہ ایک مشرکانہ کلچر تھا۔ جو عورت اور مرد پیدا ہوتے وہ اسی کے رنگ میں رنگ جاتے۔ اسی حقیقت کی طرف پیغمبر خدا ابراہیم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا: ربّ انھن اضللن کثیراً من الناس (ابراہیم ۳۶) یعنی اے میرے رب، ان بتوں نے بے شمار لوگوں کو گمراہ کر دیا۔

مشرکانہ کلچر کے اس عمومی غلبہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری انسانیت شرک اور توہم پرستی کے اوپر قائم ہو گئی۔ لوگ ان فائدوں سے محروم ہو گئے جو توحید کے زیر اثر انہیں حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کے حکم کے تحت ابراہیم نے ایک دوررس منصوبہ بنایا۔ انہوں نے اپنی زوجہ ہاجرہ اور اپنے بچہ اسماعیل کو لا کر مکہ کے پاس صحرا میں بسا دیا۔

ابراہیم خدا کے پیغمبر تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق، وہ ۲۱۶۰ ق م میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۵ ق م میں انھوں نے وفات پائی۔ ہاجرہ ان کی زوجہ تھیں۔ ان کو ان کے چھوٹے بچے اسماعیل کے ساتھ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں آباد کرنا ایک غیر معمولی قربانی کا عمل تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فطرت

کے اس ماحول میں ایک نئی نسل تیار کی جائے جو مشرکانہ تمدن کے اثرات سے پاک ہو۔ توالد وتناسل کے ذریعہ یہ نسل بنتی رہی۔ یہاں تک کہ اس عمل پر تقریباً ڈھائی ہزار سال بیت گئے۔ اس وقت اس نسل (بنواسماعیل) کی مطلوب تعداد وجود میں آچکی تھی۔ چنانچہ ۵۷۰ء میں اس نسل میں پیغمبر آخرالزماں محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

بنو اسماعیل کی نسل ایک بے حد زندہ نسل تھی۔ اس کے افراد میں تمام انسانی صفات (human qualities) پوری طرح موجود تھیں۔ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ۶۱۰ء میں مکہ میں نبوت ملی۔ ۶۳۲ء میں مدینہ میں ان کی وفات ہوئی۔ اس مدت میں آپ نے قرآن کی رہنمائی میں زبردست دعوتی عمل کیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے دولاکھ سے زیادہ عورت اور مرد اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اس طرح آپ کے پیروؤں کی ایک طاقتور ٹیم بنی جس نے تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب برپا کیا۔

یہی لوگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے بادشاہت کے مضبوط نظام کو ختم کیا۔ اس کے بعد شرک اور توہم پرستی کا دور بھی ختم ہوگیا جو قدیم بادشاہت کی سرپرستی میں قائم تھا۔

شرک کیا ہے۔ شرک فطرت کے مظاہر (سورج، چاند، دریا، پہاڑ، وغیرہ) کو پوجنے کا دوسرا نام ہے۔ اس مشرکانہ نظام کے تحت فطرت کے مظاہر پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ جب شرک مغلوب ہوا تو قدرتی طور پر فطرت کے مظاہر تحقیق وتسخیر کا موضوع بن گئے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ توہم پرستی کا دور ختم ہوکر سائنس کے دور کا آغاز ہوا۔

توہم پرستی اور بادشاہت کے خاتمہ ہی کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں بتدریج آزادی اور جمہوریت اور مختلف طبقوں کے درمیان مساویانہ اختلاط کا دور شروع ہوا۔ اس کے نتیجہ میں آخرکار وہ نئی دنیا ظہور میں آئی جس کو صنعتی تہذیب (industrial civilization) کہا جاتا ہے۔

یہ تقریباً چار ہزار سال کی کہانی ہے۔ ہاجرہ اور ان کی نسل میں پیدا ہونے والی بعد کی خواتین کی قربانی کا یہ پھل پیغمبر اسلام کے بعد ہزار سال تک انسانیت کو ملتا رہا۔ اب تقریباً دو صدی سے انسانیت

دوبارہ پہلے کی طرح ایک اور بھنور میں پھنس گئی ہے۔ یہ مادہ پرستی(materialism) کی بھنور ہے۔ پچھلے زمانہ میں اگر دنیا بت پرستی کی برائی سے دوچار تھی تو اب پچھلی دوصدی سے دنیا مادہ پرستی کی برائی میں مبتلا ہے۔ یہ دوسرے دور کی برائی کسی بھی طرح پہلے دور کی برائی سے کم نہیں۔ پچھلے دور کی برائی نے دنیا کو اگر مادی ترقیوں سے محروم کر رکھا تھا تو دوسرے دور میں خود مادی ترقی دنیا کے لئے ہلاکت کا سبب بن گئی ہے۔ اس نے انسان کو روحانی ترقی سے محروم کر رکھا ہے۔

اس ہلاکت کا سب سے برا پہلو یہ ہے کہ نظام اقدار (value system) مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ آج کے مرد اور عورت کے لئے صرف ان کی ذاتی خواہشیں ان کا واحد رہنما ہیں۔ لوگوں کے درمیان مادی مفادات کی جنگ اپنی بدترین شکل میں جاری ہے۔ ذاتی مسرت (pleasure) کو حاصل کرنا ہی لوگوں کا واحد مقصود بن گیا ہے، خواہ وہ دوسروں کی مسرتوں کا خاتمہ کر کے کیوں نہ حاصل ہو رہی ہو۔

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ دوبارہ دنیا میں ہاجرہ جیسی خواتین پیدا ہوں جو اپنی قربانیوں کے ذریعہ تاریخ کو نیا موڑ دیں، وہ مادہ پرستی کے دور کو دوبارہ توحید پرستی کے دور کی طرف واپس لے جائیں۔

موجودہ تباہ کن صورت حال کا اصل سبب کیا ہے۔ اس کا اصل سبب گھر کے ادارہ (home institution) کا تباہ ہو جانا ہے۔ گھر کا ادارہ لمبی مدت سے انسان کے لئے اقدار پر مبنی تعلیم (value based education) کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فطری نظام کے تحت پوری انسانیت ماؤں کی سرپرستی میں تربیت پا کر باہر کی دنیا میں آتی تھی۔ ہر بچہ کے سرپرست اس کی اقدار پر مبنی تعلیم (value education) کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر قدیم زمانہ میں کبھی اقدار کے بحران (value crisis) کے وہ حالات پیدا نہیں ہوئے جو موجودہ زمانہ میں عالمی سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں تحریر نسواں (women's lib.) اور صنفی برابری (gender equality)

کے انتہا پسندانہ تصور کے تحت یہ ہوا کہ عورتوں کے لئے یہ زیادہ بڑی چیز سمجھی جانے لگی کہ وہ گھر سے باہر آکر ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش کام کریں۔ ان عورتوں نے یہ نعرہ دیا کہ — کافی نہ بناؤ، پالیسی بناؤ۔

Don't make coffee, make policy

اس نعرہ کے نتیجہ میں عورتیں باہر کے شعبوں میں کام کرنے لگیں اور گھر کا محاذ (front) عملاً خالی ہو گیا۔

اس بنا پر بہت سے مصنوعی مسئلے پیدا ہوئے۔ مثلاً باہر کی زندگی میں مردوں کے لئے بے روزگاری (unemployment) اور گھریلو زندگی میں بچوں کا اخلاقی تربیت سے محروم ہو جانا۔

کچھ لوگوں نے اس اخلاقی بحران کا یہ حل پیش کیا کہ اخلاقی تعلیم (value education) کو اسکول کے نصاب میں ایک ضمنی سبجیکٹ کے طور پر شامل کر دیا جائے۔ چنانچہ بہت سے ملکوں میں اس پر عمل کیا گیا مگر نتیجہ بالکل بے سود رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طالب علم اسکول یا کالج میں جو کچھ پڑھتا ہے وہ امتحان پاس کرنے کے لئے پڑھتا ہے، وہ اس کو اپنی سیرت کی تعمیر کے طور پر نہیں لیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی تعلیم یا سیرت کی تعمیر کا کام اسی انداز پر ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ دور قدیم میں ہو رہا تھا۔ یعنی ماؤں کی سرپرستی میں گھر کے ادارہ کے ذریعہ۔

اصل یہ ہے کہ یہ کوئی سادہ کام نہیں۔ یہ تاریخ کے دھارے کو موڑنے کی بات ہے۔ اور تاریخ کے دھارے کو موڑنے کا کام صرف قربانی اور دیرپا عمل (sustained effort) کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ اسکول یا کالج میں اخلاق کے موضوع پر کچھ توسیعی لکچرس دلائے جائیں یا مارل ٹیچنگ کے نام سے کچھ پمفلیٹس تیار کر کے اس کو اسکول کے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔

دور قدیم میں جب توہم پرستانہ تمدن کا غلبہ تھا اس وقت توہم پرستی کے دور کو ختم کر کے سائنٹفک دور لانے کے لئے خواتین کے ایک گروہ نے قربانی دی۔ اس کی فہرست میں پہلا قابل ذکر نام ہاجرہ کا ہے۔ ان خواتین نے شہری سہولتوں کو چھوڑ کر صحرا کی خشک زندگی اختیار کی۔ انھوں نے آرام و راحت کو چھوڑ کر سادگی اور قناعت کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے پرسکون زندگی کو چھوڑ کر

مسائل سے بھری زندگی کو اپنایا۔ انھوں نے ذاتی خواہشوں کی تسکین کا راستہ چھوڑ کر انسانیت کے وسیع تر مفاد کو اپنے لئے چن لیا۔

اس طرح کی زندگی انہیں چند جنریشن تک گزارنی پڑی۔ اس کے بعد ان کے لئے ہر طرح کی کامیابی کے دروازے کھل گئے۔ یہاں تک کہ ان کے حال پر شاعر کا یہ شعر صادق آیا:

اگر کچھ مرتبہ چاہے تو اس ہستی کو باطل کر — کہ دانا بارور ہوتا ہے پہلے خاک میں مل کر

عام طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر قسم کی مادی ترقیوں کے باوجود ہماری مطلوب بہتر دنیا نہ بن سکی۔ آج کی دنیا میں ایک طرف مادی ترقیوں کی چمک دمک ہے اور دوسری طرف انسانی آبادیوں میں منفی رجحانات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً: نفرت اور تشدد، تناؤ اور ذہنی عدم توازن، عدم اطمینان، طلاق، انسانی قدروں کا فقدان، وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت حال کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مرد اور عورت دونوں خارجی کاموں کی ادائیگی میں لگ گئے۔ اور گھر کے ادارے کو سونا کر کے چھوڑ دیا جہاں سیرت کی تعمیر کا کام ہوتا تھا۔

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ عورت اور مرد تقسیم کار کے معروف اُصول کو اختیار کر کے اپنی اس تاریخی ذمہ داری کو ادا کریں۔ مرد تمدن کی گاڑی کو چلانے کا کام کریں۔ اور جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، وہ اسکول کی تعلیم کا چارج لے کر نسل انسانی کی تیاری کے کام میں لگ جائیں۔ تقسیم کار کا یہ فارمولا ہی واحد فارمولا ہے جس کو اختیار کر کے انسانیت کی نئی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی دوسرا فارمولا اس مقصد کے حصول کے لیے کارآمد نہیں۔

عورتیں انسانی نسل کے لئے معلم اور مربی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ عام عورتوں کو یہ بچے اپنے گھروں میں مل جاتے تھے۔ تقریباً ہر بچہ اپنی ابتدائی عمر میں گھر کی خواتین کے زیر سایہ رہ کر اپنا اخلاقی تعلیم کا کورس پورا کر لیتا تھا۔ مگر موجودہ دور میں صنعتی انقلاب نے اس صورت حال کو بدل دیا ہے۔ اب بچے اپنی ابتدائی عمر ہی سے اسکولوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔

تاہم یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس صورت حال کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب عورتوں کا مقامِ عمل (work place) بدل گیا ہے۔ اب وہ گھر سے نکل کر اسکول میں آ گیا ہے۔ ایسی حالت میں عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ بدلے ہوئے حالات کو سمجھیں اور بچوں کے اسکول کی تعلیم کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ تاکہ انسان کی تیاری کا جو کام پہلے سادہ انداز میں گھروں کے اندر ہوتا تھا وہ اب زیادہ منظّم انداز میں اسکولوں کے اندر ہونے لگے۔

انسانی نسلوں کی تربیت کے بارے میں عورت کا رول موجودہ زمانہ میں بھی بدستور جاری ہے۔ مگر زمانی تبدیلی کی بنا پر اس میں ایک فرق واقع ہوا ہے۔ پچھلے زمانہ میں گھر کا ادارہ اس مقصد کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اب عورت کو اپنی یہ فطری ذمہ داری اسکول کے ماحول میں ادا کرنا ہے۔

اس زمانی تبدیلی نے ایک اور تقاضا پیدا کیا ہے۔ وہ یہ کہ اب عورت کو سب سے پہلے خود اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہوسکتی ہے کہ وہ اسکول میں اپنے مطلوب کردار کو ادا کرنے کے قابل ہوسکے۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ عورت کو اب باقاعدہ نوعیت کی تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اس کو جدید فن تعلیم میں مہارت پیدا کرنا ہے۔ اس کو ڈگری والی تعلیم حاصل کرکے یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اسکول، بالفاظ دیگر، اپنے توسیعی مقامِ عمل (extended work place) کا چارج لے کر اپنی فطری ذمہ داری کو ادا کرنے کی پوری طرح اہل ہے۔ موجودہ زمانہ میں عورت اپنی اس ذمہ داری کو پروفیشنل ایجوکیشن کے بغیر ادا نہیں کرسکتی۔

تقسیمِ کار کا اُصول

انسانی سماج میں جو سرگرمیاں جاری ہیں اُن کا ایک حصہ حکومت ہے جس کو ایڈمنسٹریشن کہا جاتا ہے۔ اس شعبہ کا کام انتظامِ ملکی کو سنبھالنا ہے۔ موجودہ جمہوری زمانہ میں اس شعبہ کے افراد عام طور پر پانچ سال کے بعد بدل جاتے ہیں۔ ایک میعاد (term) کے خاتمہ پر اگلی میعاد کے لیے الیکشن ہوتا ہے۔ اور جو لوگ الیکشن میں چُنے جاتے ہیں وہ اگلی میعاد کے لیے نظامِ مُلکی کا کام سنبھالتے ہیں۔

یہ کسی سماج کا سیاسی شعبہ ہے۔ اس شعبہ کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر اس پر ہے کہ ہر نئی میعاد پر

آزادانہ اور منصفانہ (free and fair) الیکشن ہو۔ اور اس الیکشن میں جو لوگ چُن کر آئیں وہ دیانت داری کے ساتھ اپنی حکومتی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

اس شعبہ کے علاوہ سماج کی جو سرگرمیاں ہیں ان کو دو بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شعبہ وہ ہے جس کو پیداواری سرگرمیاں (productive activities) کہا جاتا ہے۔ یعنی زراعت اور صنعت اور اس طرح کے دوسرے شعبے جو زندگی کی ضروریات کی تیاری اور فراہمی کے ذمہ دار ہیں۔

دوسرا شعبہ وہ ہے جس کو تعلیمی سرگرمیاں (educational activities) کہا جا سکتا ہے۔ اس دوسرے شعبہ میں رسمی تعلیم (formal education) اور غیر رسمی تعلیم (informal education) دونوں ہی یکساں حیثیت سے شامل ہیں۔ یہ شعبہ اپنے مختلف شاخوں کے ساتھ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ ہر بار نئی نسل کی تعلیم و تربیت کرے۔ تاکہ انسانیت کے قافلہ کو نسل در نسل تیار شدہ افراد ملتے رہیں۔

تقسیم کار کے اصول کے مطابق، یہ ہونا چاہیے کہ حیاتِ انسانی کا پہلا شعبہ (پیداواری سرگرمیوں کا شعبہ) بنیادی طور پر مردوں کے زیر انتظام ہو۔ مرد اپنی خداداد صلاحیتوں کے صحت مند استعمال کے ذریعہ تعمیر انسانیت کا یہ کام کرتے رہیں۔ وہ ہر دور میں انسانیت کی معاشی اور اقتصادی ضرورتوں کی تعمیر کی ذمہ داری ادا کرتے رہیں۔

زندگی کا دوسرا شعبہ (تعلیمی سرگرمیوں کا شعبہ) بنیادی طور پر عورت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اس شعبہ کے سنبھالنے کے لیے عورتیں فطری طور پر زیادہ موزوں صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ اس شعبہ کو مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔

اس دوسرے شعبہ میں کئی چیزیں شامل ہیں — اسکول کی تعلیم، صحافت (جرنلزم)، ریڈیو، ٹیلی ویژن، لٹریچر، وغیرہ۔ یہی دوسرا شعبہ انسان سازی کا اصل ذمہ دار ہے۔ موجودہ دور میں نئے وسائل کی ایجاد نے اس شعبہ کو ہمیشہ سے زیادہ موثر بنا دیا ہے۔ آج اس شعبہ کو جس طرح منظّم اور ہمہ گیر

انداز میں چلایا جاسکتا ہے اُس طرح پچھلے کسی دور میں اُس کو چلانا ممکن نہ تھا۔

آج حالات کا تقاضا ہے کہ ضروری اخلاقی پابندیوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے عورتیں فارمل ایجوکیشن اور انفارمل ایجوکیشن کے تمام شعبوں کو سنبھالیں اور انسانیت کی ذہنی اور اخلاقی تعمیر کا کام کرنے میں لگ جائیں۔ وہ انسانی نسلوں کی معلم اور مربی بن کر اپنا وہ تاریخی رول ادا کریں جو قدرت نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق ان کے لیے مقدر کر دیا ہے۔ خواتین کے لیے یہ ایک اعلیٰ مشن بھی ہے اور اسی کے ساتھ ایک بہتر جاب بھی۔

اسلام کے مطابق، عورت اور مرد دونوں یکساں طور پر عزت اور احترام کے مستحق ہیں۔ حقوق اور فرائض کے معاملہ میں بھی دونوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس مساوات کا مطلب یہ نہیں کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی کام کریں۔ ہوائی جہاز میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی۔ اب اگر عورت اور مرد دونوں یہ اصرار کریں کہ ایک جو کام کرے گا وہی کام دوسرا بھی کرے گا تو جہاز پرواز نہیں کرسکتا۔ اور اگر وہ پرواز کی حالت میں ہو تو اس مساواتی نزاع میں جہاز تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کار فطرت کا ایک لازمی اُصول ہے۔ ہماری پوری زندگی تقسیم کار کے اسی اصول پر چل رہی ہے۔ تقسیمِ کار کا یہ اُصول جو عمومی سماجی زندگی میں مطلوب ہے وہی عورت اور مرد کے معاملہ میں بھی مطلوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مطلوب چیز تقسیمِ کار ہے نہ کہ صنفی مساوات (gender equality)۔

اسی فطری اُصول کو اختیار کر کے وہ متوازن نظام بنایا جاسکتا ہے جس کے اندر عورت اور مرد دونوں اپنے فرائض ادا کریں۔ اور انسانی سماج کسی تضاد کا شکار ہوئے بغیر کامیابی کے ساتھ مسلسل چلتا رہے۔

خلاصۂ کلام

اس دنیا کا نظام خالق فطرت نے زوجین کے اصول پر بنایا ہے۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ وہ صرف نر اور مادہ یا مذکر اور مونث کے دائرہ تک محدود نہیں۔ دو عناصر کے ملنے سے ایک نتیجہ نکلنے کا یہ اصول اس سے بھی زیادہ عام ہے۔ وہ اس دنیا کی تقریباً ہر چیز پر چسپاں ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی بامعنٰی واقعہ دو کے ملنے سے انجام پاتا ہے۔ مثلاً دو گیسوں (ہائیڈروجن اور آکسیجن) کے ملنے سے پانی جیسی بامعنٰی چیز کا بننا۔

اسی طرح ''دیکھنا'' اس دنیا کا ایک نہایت عجیب بامعنٰی واقعہ ہے۔ اگر ہماری دنیا میں سب کچھ ہو مگر یہاں دیکھنے کا ظاہرہ موجود نہ ہو تو ساری دنیا اچانک ایک بےمعنٰی قسم کا تاریک جنگل بن جائے گی۔ مگر دیکھنے کا یہ عمل دو چیزوں کی یکجائی سے وجود میں آتا ہے، اور وہ روشنی اور آنکھ ہے۔ اگر یہاں روشنی ہو مگر آنکھ نہ ہو، یا آنکھ ہو مگر روشنی نہ ہو تو دنیا میں سب کچھ ہوگا مگر دیکھنے کا واقعہ وجود میں نہیں آئے گا۔ جب کہ دیکھنے ہی کے واقعہ میں دنیا کی تمام رونقیں قائم ہیں۔

اسی قسم کا معاملہ عورت اور مرد کا بھی ہے۔ وہ چیز جس کو زندگی کی تعمیر کہا جاتا ہے، وہ صرف اس وقت وجود میں آسکتی ہے جب کہ مرد اور عورت دونوں اس عمل میں برابر کا حصہ ادا کریں۔ ان میں سے کوئی بھی تنہا زندگی کی تعمیر کے عمل کو انجام نہیں دے سکتا۔

تاہم اس مشترکہ عمل کو واقعہ بنانے کے لیے ایک چیز کی لازمی ضرورت ہے اور وہ ایڈجسٹمنٹ ہے۔ چکی کے دو پاٹ مل کر چلتے ہیں تب ایسا ہوتا ہے کہ گیہوں آٹے کی صورت اختیار کرے اور انسان کے لیے قابل استعمال خوراک بنے۔ مگر اس عمل میں چکی کے ایک پاٹ کو اوپر اور ایک پاٹ کو نیچے ہونا پڑتا ہے۔ اس عملی مفاہمت کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ چکی کے دو پاٹ کسی بامعنٰی چیز کو وجود میں لاسکیں۔

اسی طرح زندگی کی تعمیر میں عورت اور مرد کو جو مشترک عمل انجام دینا پڑتا ہے اس میں بھی ایڈجسٹمنٹ لازمی طور پر ضروری ہے۔

فطرت کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، عورت نصفِ انسانیت ہے۔ عزت اور مرتبہ کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں کا درجہ مکمل طور پر برابر ہے۔ سماج اور قانون کی نظر میں یہ دونوں صنفیں ہر اعتبار سے یکساں حیثیت رکھتی ہیں۔ تاہم فطرت کے عام اصول کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان تقسیمِ کار کا طریقہ رکھا گیا ہے۔ انسانی سرگرمیوں کے کچھ شعبے مرد سے متعلق ہیں اور کچھ شعبے عورت سے متعلق کیے گئے ہیں۔ انسانی سماج کی مجموعی ترقی کے لیے اس سے بہتر کوئی اور نظام نہیں۔

اسلام کے مطابق، موجودہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ مرد کا مرد ہونا بھی ایک ذمہ داری ہے، اور عورت کا عورت ہونا بھی ایک ذمہ داری۔ دونوں کے لیے کامیابی یا ناکامی کا ایک ہی معیار ہے۔ اور وہ یہ کہ دونوں اپنی تفویض کردہ ذمہ داری کی ادائیگی میں پورے اتریں۔

عورت نے ہمیشہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ اگرچہ مدون تاریخ میں اس کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔ لیکن اس کمی کا تعلق صرف عورتوں سے نہیں، بلکہ اس کا تعلق مردوں سے بھی ہے۔ تاریخ نویسی کا اسلوب جو قدیم زمانہ میں جاری ہوا، اُس میں زیادہ تر جنگی اور سیاسی شخصیتوں کے تذکرے ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے اب بھی یہ ذوق بڑی حد تک موجود ہے۔ چنانچہ غیر سیاسی مردوں کے کارنامے مدون تاریخ میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح عورتوں کی غیر سیاسی خدمات بھی، اپنی تمام عظمتوں کے باوجود، تاریخ کے صفحات میں بہت کم جگہ پاسکی ہیں۔

میرے مطالعہ اور تجربہ کے مطابق، دنیا کے تمام قابلِ ذکر واقعات کے پیچھے اکثر کوئی نہ کوئی عورت، ماں یا بیوی کے روپ میں موجود ہوتی ہے۔ آپ اگر کامیاب انسانوں کا سروے کریں اور اُن سے پوچھیں کہ تمھاری زندگی کی کامیابی میں سب سے زیادہ کس کا ہاتھ ہے، تو اکثر لوگ اپنی ماں یا اپنی بیوی یا کسی اور خاتون کا نام لیں گے۔ یہی معاملہ اُن لیڈروں کا ہے جن کی طرف بڑے بڑے واقعات منسوب کیے جاتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر نے یہ اقرار کیا ہے کہ ان کی شخصیت کو بنانے میں سب سے زیادہ دخل ان کی ماں یا ان کی بیوی یا اور کسی قریبی خاتون کا تھا۔ مشہور امریکی موجد اڈیسن (Thomas Alva Edison) کا قول ہے:

The real force behind all of my successes is my mother.

اس اعتبار سے دیکھئے تو زندگی کی تعمیر میں سب سے زیادہ مؤثر حصہ عورت کا ہوتا ہے، کبھی اعلان کے ساتھ اور اکثر بلا اعلان۔ یہ ایک ایسا انسانی تجربہ ہے جو خواہ مدون تاریخ کے صفحات میں جگہ نہ پاسکا ہو مگر اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں ہر آدمی اس کو جانتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں آزادیٔ نسواں کی تحریک عالمی سطح پر چلائی گئی۔ میرے نزدیک یہ ایک غیر فطری تحریک تھی۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ذمہ داریٔ نسواں کی تحریک چلائی جائے۔ ذمہ داریٔ نسواں کی تحریک عورتوں کے تعمیری کردار کو ابھارتی۔ مگر آزادیٔ نسواں کی غیر فطری تحریک نے صرف بے قیدی کا مزاج پیدا کیا۔

موجودہ زمانہ میں آزادی نسواں کی اس غیر فطری تحریک نے جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا ہے وہ یہ کہ انسانی تعمیر کا نصف ادارہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ یہاں تک کہ وہ انسانیت کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنے کے قابل نہ رہا۔ اب انسانیت کا مستقبل اس پر منحصر ہے کہ اس داخلی ادارہ کو دوبارہ اسی طرح قائم کیا جائے جس طرح وہ پہلے قائم تھا۔ انسانیت کی تاریخ اسی مقام پر رُکی ہوئی ہے، اور اس تاریخ کو دوبارہ اسی مقام سے سرگرمِ سفر کیا جاسکتا ہے۔

عورت ہو یا مرد، دونوں کے لیے مقدر ہے کہ وہ انسانیت کی تعمیر میں ایک عظیم کردار ادا کریں۔ اس کردار کی کامیاب ادائیگی کے لیے دونوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ وہ اُس فن کو سیکھیں جس کو فن تنظیم حیات (art of life management) کہا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت میں چھپے ہوئے امکانات (potentials) کو جانیں۔ وہ اپنی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کرکے اپنے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کریں۔ وہ ذہنی ارتقاء (intellectual development) کے ذریعہ اپنی فکری سطح کو بلند کریں۔ وہ اصولِ تمیز (principle of differentiation) میں درک حاصل کریں۔

اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت کو جانیں کہ اس دنیا میں صبر کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا۔ صبر انسان کے اندر اعتدال پیدا کرتا ہے۔ صبر انسان کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر اپنی

طاقت کو ضائع کرے۔ صبر انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اختلاف کو ٹکراؤ تک نہ جانے دے۔ صبر متحدہ جدوجہد کی لازمی ضرورت ہے۔ صبر مایوسی کو اُمید میں تبدیل کرتا ہے۔ صبر آدمی کے اندر یہ پختگی (maturity) پیدا کرتا ہے کہ جو چیزیں بدلنے کے قابل ہیں اُن کو وہ بدلے اور اُن چیزوں کے ساتھ وہ ایڈجسٹمنٹ کا معاملہ کرے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

زندگی میں کوئی بڑا رول ادا کرنے کے لیے انسان کو اپنی انا کے خول سے باہر آنا پڑتا ہے۔ اُس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سطحیت اور خودغرضی اور تنگ نظری جیسی کمزوریوں سے پاک ہو۔ وہ سادہ زندگی اور اعلیٰ سوچ(simple living, high thinking) کی خصوصیت اپنے اندر رکھتا ہو۔ وہ وقت کی قدر کو پہچانے اور اُس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔ وہ اپنے آپ کو غیر اہم یا غیر متعلق چیزوں میں اُلجھنے سے بچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کی حیثیت پیدائشی طور پر ایک عظیم امکان کی ہے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

نئی دہلی، ۱۹ جولائی ۲۰۰۴   وحیدالدین